
ہر چہرہ سچا نہیں ہوتا
آئینے میں اجنبی
بناوٹی زندگی کے پیچھے
چھپی حقیقتوں کا سفر
مصنفہ:
مریم شہزادی

❖ باب اوّل ❖

آخر دل کیوں نہیں کرتا؟

ہماری روزمرہ زندگی میں بے شمار ایسے کام ہوتے ہیں جنہیں ہم صرف یہ سوچ کر ٹال دیتے ہیں کہ میرا دل نہیں کرتا۔ کبھی ہم کہتے ہیں کہ اس کام کو کرنے کو دل نہیں مان رہا، اور کبھی یہ کہہ کر خود کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ ابھی میرا دل اس کے لیے تیار نہیں۔

لیکن کیا ہم نے کبھی خود سے یہ سوال کیا ہے کہ آخر دل کیوں نہیں کرتا؟

اکثر ہم ان کوششوں سے بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں جو ہماری زندگی کو بہتر بنا سکتی ہیں۔

صرف ایک جملہ ہمارے لیے کافی ہوتا ہے، اور ہم اسی کے سہارے اپنے قدم روک لیتے ہیں۔

حالانکہ اگر ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس ہو جائے کہ آج کی ایک چھوٹی سی کوشش ہمارے جینے کے انداز، ہمارے نظریات اور ہماری زندگی میں مثبت تبدیلی لا سکتی ہے، تو شاید ہم اپنے آپ کو اتنی آسانی سے روکنے نہ دیں۔

وقتی طور پر تو ہم اس جملے کے ذریعے اپنے دل کو تسلی دے دیتے ہیں، مگر کچھ وقت گزرنے کے بعد جب انہی فیصلوں کے نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں

تو ہم ان کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے کسی اور کو قصوروار ٹھہرانا شروع کر دیتے ہیں۔

کوئی اپنے حالات کو ذمہ دار سمجھتا ہے کوئی اپنے اردگرد کے ماحول کو، کوئی ان لوگوں کو جنہوں نے اس کا ساتھ دیا ہوتا ہے

اور اکثر لوگ سب سے پہلے اپنی قسمت کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔

مگر شاید ہم یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ کہیں ہماری آج کی حالت کی وجہ وہ فیصلے تو نہیں جنہیں ہم نے صرف اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ اس وقت ہمارا دل نہیں کر رہا تھا۔

جب بھی ہمیں کسی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اکثر ہم بغیر سوچے سمجھے فوراً اپنی قسمت یا ان وجوہات کو ذمہ

دار ٹھہرا دیتے ہیں جو اس وقت ہمیں نظر آ رہی ہوتی ہیں۔ لیکن ہم شاید ہی کبھی رک کر یہ سوچتے ہوں کہ کل جس

کام کو ہم نے صرف اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ ہمارا دل نہیں کر رہا، کہیں آج کی یہ ناکامی اسی فیصلے کا نتیجہ تو نہیں۔

اکثر ہم کہتے ہیں کہ میں نے بہت کوشش کی تھی، لیکن یہاں ایک بات سمجھنا بے حد ضروری ہے کہ کوشش کرنا اور درست سمت میں کوشش کرنا، دونوں ایک جیسی بات نہیں ہیں۔

صرف مسلسل محنت کرتے رہنا کافی نہیں ہوتا، بلکہ یہ جاننا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ہماری محنت صحیح راستے پر ہو رہی ہے یا نہیں۔

بدقسمتی سے جب ہمیں ناکامی ملتی ہے تو ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہم نے کوشش کی تھی، مگر یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ ہماری کوشش کی سمت درست تھی یا نہیں۔

شاید یہی وہ سوال ہے جو ہمیں خود سے سب سے پہلے پوچھنا چاہیے۔

اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم اپنی ناکامی کو سبق بنانے کے بجائے اسے اپنی کمزوری بنا لیتے ہیں۔

ہم یہ سوچنے کے بجائے کہ اگر یہی کام دوبارہ کرنا پڑے تو اسے بہتر طریقے سے کیسے انجام دیا جا سکتا ہے

خود کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں، اپنی صلاحیتوں پر شک کرنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حالانکہ ہر ناکامی اپنے اندر ایک سبق چھپائے رکھتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ لوگ اس سبق کو تلاش کر لیتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ صرف اپنی قسمت کو قصوروار ٹھہرا کر وہیں رک جاتے ہیں۔

ذرا ایک لمحے کے لیے تصور کیجیے کہ آپ نے اپنی ایک منزل مقرر کر رکھی ہے اور آپ کو ایک خاص وقت پر وہاں پہنچنا ہے۔

اس مقصد کے لیے آپ گھر سے نکلتے ہیں اور بس اسٹاپ پہنچتے ہیں۔ وہاں آپ کے سامنے دو بسیں کھڑی ہیں، اور دونوں آپ کو آپ کی منزل تک پہنچا سکتی ہیں۔

پہلی بس کا سفر نہایت آرام دہ اور پرسکون ہے۔

اس میں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی، لیکن یہ بس آپ کو مقررہ وقت پر منزل تک نہیں پہنچا سکے گی۔

دوسری بس کا سفر نسبتاً مشکل ہے۔ راستے میں کچھ تکالیف اور تھکن ضرور برداشت کرنی پڑے گی، مگر یہی بس آپ کو وقت پر آپ کی منزل تک پہنچا دے گی۔

اب انتخاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

اگر آپ صرف آرام کی خاطر پہلی بس کا انتخاب کرتے ہیں اور بعد میں منزل پر دیر سے پہنچتے ہیں، تو کیا آپ اپنی قسمت کو قصوروار ٹھہرا سکتے ہیں؟

یقیناً نہیں، کیونکہ فیصلہ آپ نے خود کیا تھا۔ آپ نے کوشش تو کی، لیکن اس سمت میں نہیں جو آپ کو وقت پر منزل تک پہنچا سکتی تھی۔

زندگی بھی بالکل اسی مثال کی طرح ہے۔ ہم اکثر چاہتے ہیں کہ اپنی منزل بھی حاصل ہو جائے اور راستے میں کسی قسم کی تکلیف بھی نہ اٹھانی پڑے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر قیمتی مقصد اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ قربانی، صبر اور محنت ضرور مانگتا ہے۔

جب ہم صرف آسان راستے کا انتخاب کرتے ہیں اور بعد میں اپنی منزل حاصل نہیں کر پاتے، تو ہم قسمت، حالات یا دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانا شروع کر دیتے ہیں۔

حالانکہ اصل مسئلہ نہ قسمت کا ہوتا ہے، نہ راستے کا اور نہ ہی کسی دوسرے انسان کا۔

اصل فرق اس سمت کا ہوتا ہے جس کا انتخاب ہم خود کرتے ہیں۔

لیکن بات صرف اتنی نہیں ہے۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے، جو اکثر ہمیں آگے بڑھنے سے پہلے ہی روک دیتا ہے۔

ہم خود سے کہتے ہیں کہ اگر میں نے یہ کام نہ کیا تو کیا ہی ہو جائے گا، یا میرا کیا نقصان ہوگا۔

یہی ایک سوچ آہستہ آہستہ ہماری ہمت کو کمزور کر دیتی ہے اور ہم بغیر کوشش کیے ہی اپنے قدم پیچھے ہٹا لیتے ہیں۔

لیکن اگر ہم ایک لمحے کے لیے خود سے یہ سوال کریں کہ اگر میں نے یہ کام کر لیا تو کیا ہوگا؟

ہاں، یقیناً بہت کچھ ہوگا ...

ممکن ہے یہی ایک قدم ہماری زندگی کو نئی سمت دے دے، ہمارے اندر چھپی صلاحیتوں کو بیدار کر دے، یا وہ دروازے کھول دے جن کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہ ہو۔

شاید یہی وہ سوال ہے جو ہماری سوچ کا زاویہ بدل سکتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جو ہمیں یہ سوال سوچنے ہی نہیں دیتی؟ آخر وہ کیا ہے جو ہمیں ہر بار پہلا قدم اٹھانے سے پہلے ہی روک دیتی ہے؟

اس سوال کا جواب شاید ہر انسان کے لیے مختلف ہو، لیکن میرے تجربے نے مجھے اس کا ایک ایسا پہلو دکھایا جس نے میری سوچ بدل دی۔

میری نظر میں انسان کو آگے بڑھنے سے روکنے والی سب سے بڑی چیز ہمیشہ حالات نہیں ہوتے، بلکہ بعض اوقات وہ سہولتیں اور سہارے ہوتے ہیں جو اسے یہ

احساس ہی نہیں ہونے دیتے کہ اسے خود بھی اپنی زندگی کے لیے کچھ کرنا ہے۔

ہم سب کی زندگی میں بہت سے رشتے ہوتے ہیں۔ والدین، بہن بھائی، دوست، رشتہ دار، ہر ایک کا اپنی جگہ ایک الگ مقام اور اہمیت ہوتی ہے۔

یہ رشتے ہماری طاقت بھی ہوتے ہیں، لیکن بعض اوقات یہی طاقت غیر محسوس انداز میں ہماری کمزوری بھی بن جاتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک طالب علم کو ہی دیکھ لیجیے۔ وہ پڑھنے کا ارادہ کرتا ہے، مگر جب اس کا دوست کہہ دیتا ہے کہ میں نے بھی تیاری نہیں کی، تم بھی نہ کرو، تو وہ اپنے ارادے سے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

اس کا فیصلہ اس کی اپنی سوچ سے زیادہ دوسروں کے رویے پر منحصر ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جب انسان کے پاس ہر قسم کی آسائش، مالی سہولت اور اپنوں کا سہارا موجود ہو، تو وہ اکثر یہ محسوس نہیں کرتا کہ اسے اپنی زندگی کے لیے خود بھی

جدوجہد کرنی چاہیے۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن رہتا ہے کہ اگر آج کچھ نہ بھی کیا تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

لیکن ایک لمحے کے لیے تصور کیجیے کہ اگر یہی سہارے کم ہو جائیں، اگر انسان خود کو تنہا محسوس کرنے لگے، یا اسے یہ احساس ہو جائے کہ اب اس کی منزل تک پہنچانے کے لیے کوئی دوسرا قدم نہیں اٹھائے گا، تو کیا ہوگا؟

تب انسان پہلی بار خود سے ملتا ہے۔

تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اب اس کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کوئی اور نہیں، بلکہ اس کے اپنے فیصلے کریں گے۔ یہی احساس اس کے اندر ذمہ داری پیدا کرتا ہے

اور یہی ذمہ داری اسے محنت کرنے، آگے بڑھنے اور اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اسی لیے بعض اوقات زندگی ہمیں تنہا نہیں کرتی، بلکہ ہمیں اپنے آپ سے ملانے کے لیے کچھ سہارے ہم سے دور کر دیتی ہے۔

شاید یہی وہ تجربہ تھا جس نے مجھے یہ احساس دلایا کہ دل خود نہیں رکتا، بلکہ ہماری سوچ، دوسروں کے سہاروں پر ضرورت سے زیادہ انحصار، اور ہماری عادتیں اسے رک جانے پر آمادہ کر دیتی ہیں۔

اور ان تمام وجوہات کے بعد ایک اور بنیادی وجہ سامنے آتی ہے، جسے اکثر ہم نظر انداز کر دیتے ہیں، اور وہ ہے خود پر قابو نہ ہونا۔

اگر ہمارا اپنی سوچ، اپنے جذبات اور اپنے فیصلوں پر اختیار ہی نہ ہو، تو محض ارادہ کر لینا کافی نہیں ہوتا۔

جب بھی ہم کوئی مقصد طے کرتے ہیں یا کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں، تو اس ارادے کو مقررہ وقت پر پورا کرنے کے لیے خود پر قابو ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم وہی بہانے، وہی سوال اور وہی وجوہات دہرا کر اپنے قدم خود ہی روک لیتے ہیں جن کا ذکر میں پہلے کر چکی ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اسے اختیار بھی عطا کیا ہے۔

دعا کا اختیار، فیصلہ کرنے کا اختیار اور صحیح یا غلط راستہ چننے کا اختیار۔

اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ہماری قسمت میں جو لکھا ہے، وہی ہوگا۔ لیکن میری سوچ اس سے کچھ مختلف ہے۔

میرا ماننا یہ ہے کہ ہر نیا دن اپنے ساتھ ایک نئی امید لے کر آتا ہے، اور ہر دن ہمارے سامنے بے شمار راستے کھول دیتا ہے۔ ان راستوں میں سے ہر راستہ اپنے ساتھ ایک الگ انجام رکھتا ہے۔

اب یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم کس راستے کا انتخاب کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیارِ انتخاب عطا کیا ہے۔

اگر ہم درست راستہ اختیار کریں گے تو اس کے نتائج بھی ویسے ہی ہوں گے، اور اگر ہم غلط راستہ چنیں گے تو اس کا انجام بھی ہمارے اپنے انتخاب کا نتیجہ ہوگا۔

اس کے بعد یہ کہنا کہ یہی میری قسمت میں لکھا تھا

میرے نزدیک درست نہیں، کیونکہ اس راستے کا انتخاب کسی اور نے نہیں، بلکہ ہم نے خود کیا تھا۔

ان تمام باتوں کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں، جس کی تلاش میں نے اس پورے باب میں کی تھی، اور وہ یہی ہے کہ آخر دل کیوں نہیں کرتا؟

میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ خود پر قابو نہ ہونا ہے۔ جب ہم اپنی سوچ، اپنے فیصلوں اور اپنے رویوں پر اختیار حاصل کر لیتے ہیں تو دل بھی آہستہ آہستہ ہمارا ساتھ دینے لگتا ہے۔

جب ہم دوسروں پر ضرورت سے زیادہ انحصار کرنے کے بجائے اپنی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور اپنے مقصد کو سنجیدگی سے لینا شروع کر دیتے ہیں، تو قدم خود بخود آگے بڑھنے لگتے ہیں۔

شاید مسئلہ دل کا نہیں، بلکہ ہماری سوچ کا ہوتا ہے۔ اور جب سوچ بدل جائے تو دل بھی بدلنے لگتا ہے۔

❖ باب دوم ❖

کیا ہر رشتہ نبھانا ضروری ہے؟

اگر آپ بھی برسوں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہے ہیں، یا آج تک آپ کو اس کا تسلی بخش جواب نہیں مل سکا

تو آئیے... زندگی کی حقیقت، نفسیات اور عقل کی روشنی میں مل کر اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی آخری سانس تک، زندگی اسے بے شمار حالات اور آزمائشوں سے گزارتی ہے۔

اس سفر میں بہت سے لوگ ہماری زندگی کا حصہ بنتے ہیں۔ کچھ ہمارے اپنے ہوتے ہیں، کچھ اجنبی، اور کچھ اجنبی ہوتے ہوئے بھی اپنے سے بڑھ کر محسوس ہونے لگتے ہیں۔

رشتوں کا سفر دراصل اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہم لوگوں کو ان کے ساتھ جڑے تعلق کی بنیاد پر پہچاننا شروع کرتے ہیں۔

کوئی ماں کہلاتا ہے، کوئی باپ، کوئی بہن، کوئی بھائی، کوئی دوست اور کوئی ہمسفر۔

پھر زندگی کا ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جہاں انسان شعور کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔

یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کچھ لوگ زندگی کی حقیقت کو سمجھ کر سنبھل جاتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ رشتوں اور جذبات کی بھول بھلیوں میں بھٹک جاتے ہیں۔

اور افسوس کہ کچھ لوگ پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔ مگر اپنی آخری سانس تک یہ نہیں سمجھ پاتے کہ حقیقت میں کون ان کا اپنا تھا اور کون صرف نام کا۔

وہ دوسروں کے رویوں، احسانات، بے رخی اور لاپرواہ جوابوں کا بوجھ اپنے دل و دماغ پر اٹھائے پوری زندگی گزارتے رہتے ہیں۔

انسان کو سب سے زیادہ سمجھنے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہوتا ہے،

یا جب اس کی سیکھنے اور سمجھنے کی عمر شروع ہو رہی ہوتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں "کیا ہر رشتہ نبھانا ضروری ہے؟" جیسے سوال انسان کو سب سے زیادہ پریشان کرتے ہیں۔

اس عمر میں انسان دنیا کو حقیقت کی نظر سے نہیں دیکھتا، کیونکہ اس نے ابھی دنیا کو پرکھنا، جاننا اور اس سے سیکھنا ہوتا ہے۔

اسی لیے جو بھی انسان اس کی زندگی میں آتا ہے، وہ اس سے خلوص اور اپنائیت کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔

اسے لگتا ہے کہ شاید سامنے والا اس کی بات سمجھے گا، اس کا احساس کرے گا اور ہر حال میں اس کا ساتھ دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے سب سے مخلص رشتے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتے ہیں، اور اس کے بعد والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ لیکن ہر انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے

کہ جب وہ اپنے دل کی ہر بات اپنے گھر والوں سے نہیں کر پاتا۔ کچھ احساسات، کچھ الجھنیں اور کچھ راز ایسے

ہوتے ہیں جو وہ اپنے قریب ترین لوگوں سے بھی بیان نہیں کر سکتا۔ تب وہ اپنے لیے سہارے اور رشتے گھر سے باہر تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔

اس عمر میں اکثر نوجوانوں کو اپنے والدین کی نصیحتیں، روک ٹوک یا پابندیاں غلط محسوس ہوتی ہیں۔

انہیں لگتا ہے کہ شاید ان کے والدین انہیں سمجھ نہیں رہے یا ان کی آزادی چھین رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ والدین زندگی کے کئی موسم دیکھ چکے ہوتے ہیں، اسی لیے ان کی باتوں میں تجربہ اور خیرخواہی چھپی ہوتی ہے۔

افسوس کہ جس عمر میں ہم ان کی باتوں کو غلط سمجھ رہے ہوتے ہیں، اسی عمر میں ہمارا اپنا تجربہ ابھی بہت محدود ہوتا ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر پابندی صرف پابندی ہی ہو۔ بعض اوقات یہی پابندیاں ہماری زندگی کا سب سے بڑا سبق، سب سے مضبوط حفاظت اور مستقبل کی سب سے قیمتی رہنمائی ثابت ہوتی ہیں۔

جب انسان اپنے قریبی رشتوں سے دور ہو کر باہر کی دنیا میں اپنے لیے سہارے تلاش کرنا شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے جس رشتے سے اس کا واسطہ پڑتا ہے، وہ دوستی کا رشتہ ہوتا ہے۔

ہم کسی کو بھی دوست کا نام دے دیتے ہیں، اور پھر اسی ایک رشتے کے ساتھ اپنے جذبات، اپنے راز، اپنی امیدیں اور اپنا اعتماد وابستہ کر لیتے ہیں۔

لیکن جب انسان کسی سے جذباتی طور پر جڑ جاتا ہے تو اس رشتے سے ملنے والی چوٹیں بھی سب سے گہری ہوتی ہیں۔

بعض اوقات یہی جذباتی زخم انسان کو اتنا توڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنی جوانی کی سب سے قیمتی عمر، جو سیکھنے، آگے بڑھنے اور خود کو بنانے کے لیے تھی، انہی دکھوں اور الجھنوں میں گزار دیتا ہے۔

کیونکہ یہی وہ عمر ہوتی ہے جس میں اگر کوئی انسان ہماری زندگی میں آتا ہے، یا کوئی نیا رشتہ بنتا ہے، تو ہم اس کے ساتھ جذباتی طور پر منسلک ہو جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہم اس پر انحصار کرنے لگتے ہیں، اس سے توقعات

وابستہ کر لیتے ہیں، اور اسے اپنی زندگی کا اہم حصہ سمجھنے لگتے ہیں۔

لیکن جب وہی لوگ ہماری توقعات کے مطابق ہمیں سمجھ نہیں پاتے، ہمارا ساتھ نہیں دے پاتے، ہماری رہنمائی نہیں کر پاتے، یا کسی الجھن میں ہمیں سیدھا راستہ دکھانے کے بجائے خود ہی ہمیں مزید الجھا دیتے ہیں،

تو آہستہ آہستہ حقیقت ہمارے سامنے آنا شروع ہو جاتی ہے کہ شاید وہ ہمارے لیے اتنے مخلص نہیں تھے جتنا ہم نے انہیں سمجھ لیا تھا۔

اور جب انسان ان حقیقتوں سے آشنا ہونے لگتا ہے تو سب سے پہلے اس کے جذبات زخمی ہوتے ہیں۔ پھر وہ ایک ایسی جنگ لڑنا شروع کر دیتا ہے جس میں وہ بالکل اکیلا ہوتا ہے۔

ایک ایسی جنگ، جس کے شور کو کوئی سن نہیں سکتا، اور جس کے زخم کسی کو دکھائے بھی نہیں جا سکتے۔

تب اس کے دل میں ایک کے بعد ایک سوال جنم لینے لگتے ہیں۔

آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟

آخر سب لوگ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کرتے ہیں؟

آخر مجھے ہی کوئی کیوں نہیں سمجھ پاتا؟

کیا واقعی غلطی ہمیشہ میری ہی ہوتی ہے؟

شاید اپنی کم علمی اور کم تجربے کی وجہ سے وہ ان سوالوں کے جواب تلاش نہیں کر پاتا۔

اور اسی تلاش میں انسان نہ جانے کتنے لوگوں سے ملتا ہے، کتنے رشتے بناتا ہے، اور کبھی کبھی انہی رشتوں میں خود کو مزید کھوتا چلا جاتا ہے۔

انسان کی زندگی کا یہی مرحلہ سب سے زیادہ قیمتی اور فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اسی عمر میں اسے یہ سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ زندگی میں آنے والا ہر شخص مستقل نہیں ہوتا، اور نہ ہی ہر تعلق اخلاص پر قائم ہوتا ہے۔

کچھ لوگ ہماری زندگی میں صرف ایک مختصر وقت کے لیے آتے ہیں، اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

اس لیے ہر انسان پر بھروسا کر لینا اور ہر رشتے کو اپنی پوری دنیا بنا لینا دانشمندی نہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ جب انسان کسی ذہنی یا جذباتی پریشانی کا شکار ہوتا ہے تو اکثر وہ اپنے سب سے مخلص رشتوں، یعنی اپنے والدین یا گھر والوں سے ہی اپنے دل کی بات نہیں کرتا۔

یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جہاں انسان اپنی زندگی کے سب سے غلط راستے کا انتخاب کر بیٹھتا ہے۔

پھر وہ نہ جانے کن لوگوں سے رہنمائی لینے لگتا ہے اور کن راستوں پر چل پڑتا ہے، حالانکہ وہ ابھی خود سیکھنے اور دنیا کو سمجھنے کے ابتدائی مرحلے میں ہوتا ہے۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے اسی عمر میں کرنا شروع کر دیتا ہے، جب اس کا تجربہ ابھی مکمل نہیں ہوتا۔

آہستہ آہستہ وہ خود اپنی ذات سے دور ہونے لگتا ہے۔ پھر اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد صرف دوسروں کو خوش رکھنا، ان کی توقعات پر پورا اترنا، ان کی سوچ کے مطابق خود کو بدل لینا اور ہر

وقت اس فکر میں مبتلا رہنا ہے کہ لوگ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے۔

حالانکہ انسان کی زندگی کا مقصد ہرگز یہ نہیں۔

یہ عمر بے حد حساس ہوتی ہے، کیونکہ اس دوران کی گئی ایک معمولی غلطی بھی بعض اوقات پوری زندگی کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

تقریباً بیس سے پچیس برس کی عمر وہ بنیاد ہوتی ہے جس پر انسان اپنی آنے والی زندگی کی عمارت تعمیر کرتا ہے۔ اسی عرصے میں وہ طے کرتا ہے کہ آیا وہ علم، شعور اور درست فیصلوں کی بنیاد پر اپنی شخصیت کو مضبوط بنائے گا، یا دوسروں کے سہارے اور ان کی رائے پر انحصار کرتے ہوئے اپنی زندگی گزارے گا۔

اسی مرحلے پر انسان کے لیے سب سے بڑا امتحان خود کو جذباتی مضبوط بنانا اور اپنے نفس کو قابو میں رکھنا ہوتا ہے۔

اسے خود کو اس انداز سے تربیت دینی چاہیے کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے انجام پر ضرور غور کرے۔

اسے اپنے آپ سے یہ سوال ضرور کرنا چاہیے
کہ اگر میں یہ فیصلہ کروں گا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟
کیا یہ فیصلہ میرے لیے فائدہ مند ہوگا یا نقصان دہ؟

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم کسی نئے رشتے کا آغاز کرتے ہیں یا زندگی میں کوئی نیا فیصلہ کرتے ہیں، تو اس کے نتائج پر غور کیے بغیر صرف جذبات کی بنیاد پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

پھر جب حقیقت ہماری توقعات کے برعکس سامنے آتی ہے تو ہم حیران، پریشان اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ اسی پریشانی میں انسان کئی ایسے فیصلے کر بیٹھتا ہے جن پر بعد میں اسے پچھتانا پڑتا ہے۔

اسی لیے اس عمر میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ انسان خود کو جذباتی طور پر مضبوط بنائے۔ اپنے دل کو یہ سمجھائے کہ ہر رشتہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتا، نہ ہی ہر شخص ہماری زندگی میں مخلص بن کر آتا ہے۔ بہت سے لوگ صرف ایک سبق بن کر آتے ہیں، ہمیں کچھ سکھاتے ہیں اور پھر ہماری زندگی سے گزر جاتے

ہیں۔

اس لیے ہر بات کو دل پر لینا ضروری نہیں، اور نہ ہی ہر انسان کو اپنی زندگی میں اتنی اہمیت دینی چاہیے کہ اس کے چند الفاظ، چند روپے یا چند لمحے ہماری سوچ، ہمارے فیصلوں اور ہماری پوری زندگی کا رخ بدل دیں۔

آخر کیوں؟ کیونکہ انسان کا اصل سہارا، کامل بھروسا اور دائمی امید صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ انسان کا دل بھی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس پر بھروسا کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"اور جو اللہ پر بھروسا کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔"

(سورۃ الطلاق: 3)

جب انسان اپنے دل کی وہ محبت، وہ وابستگی اور وہ اعتماد، جس کا سب سے زیادہ حق اللہ تعالیٰ کو ہے، کسی ایسے انسان سے وابستہ کر لیتا ہے جو خود بھی بے بس ہے، تو پھر وہ اکثر ٹوٹ جاتا ہے۔

دنیا کے بہت سے لوگ ہماری زندگی میں مستقل رہنے کے لیے نہیں آتے، بلکہ وہ صرف ایک سبق بن کر آتے ہیں۔ وہ نہ ہماری تقدیر بدل سکتے ہیں، نہ ہمارے لیے ہر

بھلائی کا سبب بن سکتے ہیں، اور نہ ہی ہر حال میں ہمارا سہارا بن سکتے ہیں۔

لیکن ان تمام حقیقتوں کو جان لینے کے بعد ایک اور اہم سوال جنم لیتا ہے۔

آخر انسان یہ کیسے پہچانے کہ کون سا رشتہ نبھانے کے قابل ہے اور کون سا نہیں؟

وہ کون سا معیار ہے جس کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اب اس رشتے میں رکنا چاہیے یا آگے بڑھ جانا چاہیے؟

اور آخر کیسے معلوم ہو کہ کون سا تعلق انسان کی زندگی کے لیے نعمت ہے، اور کون سا صرف ایک سبق؟

ان سوالوں کا جواب جانے بغیر یہ فیصلہ کرنا کہ کون سا رشتہ نبھانا چاہیے اور کون سا نہیں، شاید ممکن ہی نہیں۔

ان تمام سوالوں کے جواب تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں ایک حقیقت کو دل سے قبول کرنا ہوگا کہ ہر انسان ہمارے لیے مخلص نہیں ہوتا۔

اس کے بعد پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جن مخلص رشتوں سے ہمیں نوازا ہے، ہم ان کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط رکھیں۔ والدین، بہن بھائی اور وہ لوگ جو واقعی ہمارے خیرخواہ ہیں، ان پر اعتماد کرنا سیکھیں۔

تاکہ اگر زندگی کے کسی موڑ پر ہم کسی ایسی آزمائش یا الجھن میں مبتلا ہو جائیں جہاں ہمیں کوئی راستہ دکھائی نہ دے، تو ہم بلا جھجک ان سے رہنمائی لے سکیں، ان سے مشورہ کر سکیں اور اپنے دل کی بات ان تک پہنچا سکیں۔

اس کے بعد چونکہ ہمیں اسی دنیا میں رہنا ہے، اور اسی دنیا کے مختلف مزاج، مختلف سوچ اور مختلف کردار رکھنے والے لوگوں سے ہمارا واسطہ بھی پڑے گا، اس لیے ہر نئے تعلق کو قبول کرنے سے پہلے ایک سوال ضرور اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔

کیا یہ رشتہ مجھے اللہ تعالیٰ کے قریب کر رہا ہے، یا مجھ کو اللہ تعالیٰ سے دور لے جا رہا ہے؟

کیونکہ جو تعلق انسان کو اس کے خالق سے دور کر دے، وہ بظاہر کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ دکھائی دے، حقیقت

میں وہ کبھی اس کی بھلائی، رہنمائی اور کامیابی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

یہی وہ پہلی پہچان ہے جس کی بنیاد پر ہر رشتے کو پرکھنا چاہیے۔اگر انسان اس پہلی پہچان میں کامیاب ہو جائے تو وہ بہت سی ایسی غلطیوں سے خود کو بچا لیتا ہے

جو بعد میں اس کی زندگی کا سببِ ندامت بنتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس کے دل کو حق اور باطل میں فرق کرنے کی سمجھ عطا فرماتا ہے، اور اسے ایسے لوگوں سے بچنے کی توفیق دیتا ہے جو صرف اس کے جذبات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں، اسے محض استعمال کریں یا اس کا قیمتی وقت اور سکون ضائع کر دیں۔

:شاید یہی احساس میرے قلم سے بےاختیار یوں نکل آیا

،میں ہر رشتے کو محرمِ راز سمجھ بیٹھی تھی

مگر افسوس! محرومی کے سوا کچھ نہ ملا۔

اس بات کو مزید گہرائی سے سمجھنے کے لیے ایک حقیقت کو جاننا ضروری ہے کہ ہر انسان کی ایک فطرت، ایک مزاج اور ایک طبیعت ہوتی ہے۔

اسی فطرت کی بنیاد پر اس کے رویے، فیصلے اور دوسروں کے ساتھ اس کا برتاؤ ظاہر ہوتا ہے۔

اگر کسی انسان کی عادت دھوکہ دینا، جھوٹ بولنا یا لوگوں سے فائدہ اٹھانا بن چکی ہو، تو صرف ہماری خواہش یا سمجھانے سے ضروری نہیں کہ وہ فوراً بدل جائے۔

اسی طرح اگر کسی کی طبیعت میں محبت، مہربانی، اخلاص اور احسان ہو، تو دنیا کے بے شمار تلخ تجربات کے باوجود بھی وہ اپنے اچھے اخلاق کو آسانی سے نہیں چھوڑتا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک مثال کافی ہے۔ سانپ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں زہر رکھا ہے۔

اگر وہ کسی کو ڈس لے تو اس سے یہ سوال کرنا کہ "تم نے مجھے ہی کیوں ڈسا؟" شاید دانشمندی نہیں، کیونکہ وہ اپنی فطرت کے مطابق ہی عمل کر رہا ہے۔

بالکل اسی طرح اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی عادت دوسروں کو تکلیف پہنچانا، ان کے جذبات سے کھیلنا یا صرف اپنے مفاد کے لیے تعلقات بنانا

ہوتی ہے۔ ایسے لوگ کبھی اپنے الفاظ سے زخم دیتے ہیں اور کبھی اپنے رویوں سے۔

اگر کبھی ہماری زندگی میں بھی کوئی ایسا شخص آ جائے جو اپنی اسی طبیعت کے مطابق ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جو ہماری توقعات کے بالکل برعکس ہو، تو ہمیشہ اس سے یہ پوچھتے رہنا کہ "تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟" شاید مسئلے کا حل نہیں۔

بعض اوقات سب سے بہتر فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ انسان حقیقت کو قبول کرے، اس سے سبق سیکھے اور خاموشی کے ساتھ اس تعلق سے مناسب فاصلے اختیار کر لے۔

شاید میرے نزدیک یہی وہ سب سے اہم مرحلہ ہے جہاں انسان خود کو یہ سمجھا سکتا ہے کہ ہر شخص ہماری زندگی میں ہماری بھلائی کے لیے نہیں آتا۔ کچھ لوگ صرف ایک سبق بن کر آتے ہیں، اور ان کا کردار وہیں ختم ہو جاتا ہے۔

اس لیے ہمیں اپنے اندر اتنی ہمت، برداشت اور جذباتی مضبوطی پیدا کرنی چاہیے کہ اگر کوئی انسان اپنے الفاظ یا

اپنے رویوں سے یہ واضح کر دے کہ اب اس کے دل میں ہمارے لیے اخلاص، خیرخواہی یا ساتھ نبھانے کی خواہش باقی نہیں رہی، تو ہم اس حقیقت کو قبول کر لیں۔

کیونکہ کسی ایسے شخص کو روکنے کی کوشش کرنا، جو خود دل سے جا چکا ہو، یا بار بار اس سے یہ التجا کرنا کہ وہ ہمارے ساتھ ایسا نہ کرے، اکثر ہمارے وقار، ہمارے سکون اور ہماری عزتِ نفس ہی کو نقصان پہنچاتا ہے۔

جب انسان خود کو اس مقام تک مضبوط بنا لیتا ہے تو پھر وہ دنیا اور اس کے لوگوں کو پہلے سے زیادہ بہتر انداز میں سمجھنے لگتا ہے۔

اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر تعلق ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتا، اور نہ ہی ہر شخص ہماری زندگی میں رہنے کے لیے آتا ہے۔

تب انسان ہر بچھڑنے والے رشتے کو نفرت کے ساتھ نہیں، بلکہ ایک خاموش مسکراہٹ، ایک سیکھے ہوئے سبق اور اللہ پر بھروسا رکھتے ہوئے رخصت کرنا سیکھ لیتا ہے۔

ہمیں چاہیے کہ اپنی امیدوں کا مرکز لوگوں کو نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بنائیں۔ کیونکہ جب ہم اپنی تمام توقعات

انسانوں سے وابستہ کر لیتے ہیں اور پھر ان کے پورا نہ ہونے پر دل شکستہ ہو جاتے ہیں، تو اس میں قصور ہمیشہ دوسروں کا نہیں ہوتا، کبھی کبھی ہم نے بھی اپنی امید غلط جگہ باندھی ہوتی ہے۔

یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ہر رشتہ نبھانا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ ہر رشتے کو اس کی حقیقت، اس کی حدود اور اس کے معیار کے مطابق جگہ دینا ضروری ہوتا ہے۔

کسی سے فاصلے اختیار کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم لوگوں سے نفرت کرنے لگیں یا خود کو دنیا سے کاٹ لیں۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم اپنے دل، اپنی عزتِ نفس اور اپنے سکون کی حفاظت کرنا سیکھ جائیں۔

اسی کے ساتھ ایک اور حقیقت کو سمجھنا بھی بے حد ضروری ہے، اور وہ ہے خود کو سمجھنا، اپنی قدر جاننا اور اپنی اہمیت کو پہچاننا۔ جب انسان اپنی ذات کی قدر کرنا سیکھ لیتا ہے تو پھر وہ اپنی زندگی کا مقصد صرف دوسروں کو خوش کرنا نہیں سمجھتا، بلکہ اپنی شخصیت کو بہتر بنانے، اپنے علم میں اضافہ کرنے اور اپنے رب سے تعلق مضبوط کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ہمیں خود احتسابی سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کسی تعلق کا انجام ہماری توقعات کے مطابق نہ ہو، تو صرف دوسروں کی غلطیاں تلاش کرنے کے بجائے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس میں ہماری کیا کمی تھی۔

کیونکہ غلطی کرنا برا نہیں، بلکہ ایک ہی غلطی کو بار بار دہرانا اور اس سے سبق نہ سیکھنا انسان کو نقصان پہنچاتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر مشکل رشتہ ختم کر دینا دانشمندی نہیں۔ بہت سے تعلقات صرف صبر، گفتگو، اصلاح اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے محتاج ہوتے ہیں۔

جہاں اصلاح کی گنجائش ہو، وہاں صبر اور حکمت کے ساتھ تعلق کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن جہاں واضح ہو جائے کہ کوئی تعلق مسلسل نقصان، بے سکونی یا غلط راستے کا سبب بن رہا ہے، وہاں اپنی حدود مقرر کر لینا ہی حکمت ہے۔

اگر میں اپنی زندگی کے تجربے کو ایک جملے میں بیان کروں تو شاید وہ یہی ہوگا کہ زندگی نے مجھے سکھایا ہے کہ ہر ملنے والا انسان ہماری منزل نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ دعا بن کر آتے ہیں، کچھ نعمت بن کر، کچھ سبق بن کر، اور

کچھ صرف یہ سکھانے کے لیے کہ ہر انسان مستقل طور پر ہماری زندگی میں رہنے اتا ہے

اسی لیے ہر انسان کو اس کی حقیقت کے مطابق پہچاننا، ہر رشتے کو اس کی مناسب جگہ دینا، اور اپنی امیدوں کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ کو بنانا ہی ایک پُرسکون زندگی گزارنے کی حقیقی حکمت ہے۔

آخرکار زندگی انسان کو یہی سکھاتی ہے کہ سکون ہر تعلق کو تھام لینے میں نہیں، بلکہ ہر تعلق کی حقیقت کو قبول کر لینے میں ہے۔ جب انسان یہ ہنر سیکھ لیتا ہے، تو پھر نہ کسی کے آنے سے خود کو کھو دیتا ہے اور نہ کسی کے جانے سے خود کو ٹوٹنے دیتا ہے۔

❖ باب سوم ❖

خلوتِ ذات

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس کے وجود میں احساس کی گہرائی رکھی ہے۔ کوئی بھی انسان اپنی زندگی میں خواہ کتنا ہی مضبوط اور باہمت کیوں نہ بن جائے، کچھ رشتے ایسے ضرور ہوتے ہیں جن سے اس کا تعلق اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ان میں ذرا سی دراڑ بھی اسے اندر سے توڑ دیتی ہے۔

بعض رشتے انسان کی زندگی کا ایسا حصہ بن جاتے ہیں کہ وہ کبھی یہ تصور بھی نہیں کر پاتا کہ ایک دن وہ اس سے جدا ہو سکتے ہیں۔

لیکن زندگی اپنے اصولوں پر چلتی ہے۔ یہاں ہر لمحہ بدل سکتا ہے، حالات بدل سکتے ہیں اور رشتے بھی۔ ہر انسان

کا رشتوں کو دیکھنے، نبھانے اور زندگی کو سمجھنے کا انداز ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

کچھ لوگ ہر تعلق کو جذبات کی نظر سے دیکھتے ہیں، جبکہ کچھ کے لیے چند مخصوص رشتوں کے علاوہ باقی سب معمول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں محبت، تعلق اور اپنائیت کی خواہش رکھی ہے۔ اسی لیے کوئی بھی انسان پوری زندگی مکمل تنہائی میں نہیں گزار سکتا۔

اسے کسی نہ کسی موڑ پر کسی مخلص ساتھی، کسی ہمدرد یا کسی ایسے رشتے کی ضرورت ضرور محسوس ہوتی ہے جو اس کے احساسات کو سمجھ سکے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ہر چیز کو جوڑوں کی صورت میں پیدا فرمایا۔

انسان بھی اسی نظام کا حصہ ہے، اس لیے وہ مکمل طور پر لوگوں سے کٹ کر زندگی گزارنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

آج اگر ہم اپنے اردگرد نظر ڈالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ زیادہ تر لوگ خود کو کبھی تنہا ہونے ہی نہیں دیتے۔ وہ ہر

وقت کسی نہ کسی مصروفیت، محفل یا تعلق میں خود کو الجھائے رکھتے ہیں۔ بعض اوقات ان تعلقات میں خلوص بھی نہیں ہوتا، پھر بھی وہ انہیں نبھاتے رہتے ہیں، صرف اس لیے کہ انہیں تنہا رہنے سے خوف محسوس ہوتا ہے۔

لیکن کبھی ہم نے خود سے یہ سوال کیا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا واقعی تنہائی ایک سزا ہے، یا ہم نے اسے بلاوجہ سزا سمجھ لیا ہے؟

شاید ہی ہم میں سے بہت کم لوگوں نے کبھی اس سوال پر سنجیدگی سے غور کیا ہو۔ ہم میں سے اکثر لوگ زندگی بھر خود کو کسی نہ کسی مصروفیت، تعلق یا محفل میں الجھائے رکھتے ہیں، مگر کبھی چند لمحوں کے لیے رک کر خود سے یہ نہیں پوچھتے کہ آخر ہمیں تنہائی سے اتنا خوف کیوں محسوس ہوتا ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہر انسان کو زندگی میں کم از کم ایک ایسے مخلص رشتے کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے صحیح راستہ دکھا سکے، اس کے دکھ کو سمجھ سکے اور اخلاص کے ساتھ اس کا ساتھ دے۔ لیکن ایک بات ایسی بھی ہے جس پر غور کرنا ضروری ہے۔

اگر کسی محفل میں سینکڑوں لوگ موجود ہوں تو ان میں بہت کم ایسے افراد ہوں گے جو کچھ دیر تنہا بیٹھنے کو ترجیح دیں۔ زیادہ تر لوگ اسی محفل کا حصہ بنے رہتے ہیں، چاہے وہاں ان کی بات سنی جائے یا نہ سنی جائے، انہیں اہمیت دی جائے یا نہ دی جائے۔

وہ صرف اس لیے وہاں موجود رہتے ہیں کہ کہیں انہیں تنہا نہ ہونا پڑ جائے۔

لیکن آخر ایسا کیوں ہے؟

کیا واقعی انسان تنہائی سے ڈرتا ہے، یا پھر اس نے تنہائی کو اپنے ذہن میں ایک سزا کی صورت دے دی ہے؟

شاید ہم نے کبھی اپنے دل سے یہ سوال ہی نہیں کیا، اور نہ ہی اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی۔

زندگی میں اکیلے چلنا آسان نہیں ہوتا۔ ہم لوگوں کے ساتھ ہوں تو اجنبی راستے بھی آسان محسوس ہوتے ہیں، لیکن جب اپنے ہی شہر، اپنی ہی گلی یا اپنے ہی ماحول میں تنہا چلنا پڑ جائے تو قدم بھی کچھ بوجھل محسوس ہونے لگتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اکیلا بیٹھا نظر آئے تو لوگ فوراً سوال کرتے ہیں: "اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟" یا "سب خیریت تو ہے؟"

گویا ہمارے معاشرے میں تنہا ہونا ایک غیر معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ اکثر لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید اس شخص کے ساتھ کوئی مسئلہ پیش آیا ہے، یا وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔ حالانکہ ہر تنہائی دکھ کی علامت نہیں ہوتی۔

تنہائی بعض اوقات انسان کو نقصان بھی پہنچاتی ہے، لیکن یہی تنہائی اگر صحیح انداز سے اختیار کی جائے تو انسان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ بھی بن سکتی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم تنہائی کے فائدوں کی بات کریں، ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ آخر تنہائی نقصان دہ کب بنتی ہے۔

لوگ اکثر ان مواقع پر خاموش ہو جاتے ہیں جہاں وہ سچے ہونے کے باوجود بولنے کی ہمت نہیں کر پاتے۔

بعض اوقات وہ کسی رشتے کو بچانے کی خاطر خاموش رہتے ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود کو بار بار

صحیح ثابت کرتے کرتے ان کے اندر یہ طاقت ہی باقی نہیں رہتی۔

ایسے میں وہ اپنے حالات کو قسمت کے حوالے کر دیتے ہیں اور خاموشی کو ہی اپنا سہارا بنا لیتے ہیں۔

لیکن میرے خیال میں ہر خاموشی درست نہیں ہوتی۔ اگر کسی جگہ ہمارے بولنے سے کوئی غلط فہمی دور ہو سکتی ہو، کسی رشتے کو بچایا جا سکتا ہو، کسی حق کا دفاع ہو سکتا ہو یا کسی ظلم کو روکا جا سکتا ہو، تو وہاں خاموش رہنے کے بجائے ضرور بولنا چاہیے۔

بعض اوقات انسان کے چند سچے جملے ایسے نتائج پیدا کر دیتے ہیں جو برسوں کی خاموشی بھی پیدا نہیں کر سکتی۔

بہت سے خوبصورت رشتے صرف اس لیے ٹوٹ جاتے ہیں کہ دونوں طرف خاموشی ہوتی ہے اور درمیان میں غلط فہمیاں جگہ بنا لیتی ہیں۔

ایک شخص یہ انتظار کرتا رہتا ہے کہ دوسرا پہلے بولے، اور دوسرا بھی یہی سوچتا رہتا ہے۔

یوں وقت گزر جاتا ہے، فاصلے بڑھ جاتے ہیں اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب صرف پچھتاوا باقی رہ جاتا ہے۔

خاموشی سب سے زیادہ نقصان دہ اس وقت بنتی ہے جب انسان اندر ہی اندر ٹوٹ چکا ہو۔ جب وہ مایوسی، احساسِ کمتری یا مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے خود پر یقین کھو بیٹھے، اپنے احساسات کو دبا دے اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔

ایسی تنہائی انسان کو آہستہ آہستہ اندر سے ختم کرنے لگتی ہے۔

پھر وہ ان مواقع پر بھی نہیں بولتا جہاں بولنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ اپنے حق کے لیے آواز نہیں اٹھاتا، اپنی صفائی پیش نہیں کرتا، اور نہ ہی اپنی زندگی کے بہتر فیصلے کرنے کی ہمت جمع کر پاتا ہے۔

آخرکار اس کے ہاتھ میں صرف افسوس رہ جاتا ہے کہ کاش وہ وقت پر بول لیتا، کاش اس نے خود کو اتنا بے بس نہ سمجھا ہوتا۔

اسی لیے میرا ماننا ہے کہ جہاں ہمارے بولنے سے خیر پیدا ہو، جہاں ہمارے چند الفاظ کسی الجھن کو سلجھا سکتے

ہوں، جہاں ہمارا ایک فیصلہ ہماری یا کسی اور کی زندگی میں مثبت تبدیلی لا سکتا ہو، وہاں خاموش رہنے کے بجائے ضرور بولنا چاہیے۔

لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ مایوسی، احساسِ کمتری اور شکست خوردگی کے ساتھ اختیار کی جانے والی تنہائی کبھی فائدہ نہیں دیتی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس فطرت پر پیدا ہی نہیں کیا کہ وہ پوری زندگی سب سے کٹ کر گزار دے۔ انسان کو انسانوں کی ضرورت رہتی ہے، کسی نہ کسی مرحلے پر ضرور رہتی ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تنہائی کا ایک نقصان دہ پہلو ہے، تو کیا اس کا کوئی روشن پہلو بھی ہے؟

میرا جواب ہے، جی ہاں۔

اگر تنہائی کے فائدوں کی بات کی جائے تو میرے نزدیک تنہائی انسان کی زندگی کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک بھی ہو سکتی ہے، بشرطیکہ اسے درست انداز میں اختیار کیا جائے۔

میرا تجربہ مجھے یہ سکھاتا ہے کہ اگر انسان کبھی تنہا نہ ہو تو وہ خود سے کبھی نہیں مل سکتا۔

اس دنیا، اس کائنات، زندگی اور انسانوں سے متعلق بہت سی ایسی حقیقتیں ہیں جنہیں شاید انسان مسلسل ہجوم میں رہ کر کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا۔

ہم اپنی پوری زندگی دوسروں کو وقت دینے، ان کی توقعات پوری کرنے، تعلقات نبھانے اور خود کو مصروف رکھنے میں گزار دیتے ہیں۔ اس مصروفیت میں شاید ہمیں یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ہم خود اپنے لیے کیا ہیں، ہماری اپنی خواہشات کیا ہیں، ہماری کمزوریاں کیا ہیں اور ہماری اصل منزل کیا ہے۔

لیکن جب انسان کچھ وقت تنہائی میں گزارتا ہے تو وہ پہلی مرتبہ اپنی ذات سے سوال کرنا شروع کرتا ہے۔

وہ خود سے پوچھتا ہے کہ میں کون ہوں؟ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ میں اپنی نظر میں کتنی اہمیت رکھتا ہوں؟ کیا میں صرف دوسروں کے لیے جی رہا ہوں، یا میں نے کبھی اپنے لیے بھی جینا سیکھا ہے؟

تنہائی انسان کو خود اپنا محاسبہ کرنے کا موقع دیتی ہے۔ وہ اپنی غلطیوں کو دوسروں کی آوازوں میں نہیں، بلکہ اپنی خاموشی میں پہچانتا ہے۔

اسے اپنی کمزوریاں بھی نظر آنے لگتی ہیں اور اپنی صلاحیتیں بھی۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسے کس راستے پر چلنا چاہیے اور کن راستوں سے واپس لوٹ آنا چاہیے۔

بعض اوقات انسان تنہائی میں وہ حقیقتیں سمجھ لیتا ہے جو شاید سینکڑوں کتابیں بھی اسے نہ سمجھا سکیں۔

کیونکہ کچھ اسباق الفاظ نہیں سکھاتے، بلکہ خاموشی سکھاتی ہے۔ کچھ حقیقتیں صرف اس وقت سامنے آتی ہیں جب انسان چند لمحوں کے لیے دنیا کے شور سے الگ ہو کر اپنے دل کی آواز سننے لگتا ہے۔

لیکن یہاں ایک بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔ صرف تنہا ہونا کوئی بڑی بات نہیں، بلکہ تنہا رہتے ہوئے اپنے آپ کو صحیح سمت میں قائم رکھنا اصل امتحان ہے۔

ہر انسان اکیلا تو ہو سکتا ہے، مگر ہر انسان تنہائی کو اپنی اصلاح، اپنی ترقی اور اپنی پہچان کا ذریعہ نہیں بنا سکتا۔

تنہائی اگر انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب لے آئے، اسے اپنی حقیقت پہچاننے کا موقع دے، اس کے اندر امید پیدا کرے اور اسے پہلے سے بہتر انسان بنا دے، تو ایسی تنہائی سزا نہیں بلکہ ایک نعمت ہے۔

اگر تنہائی کو نفسیات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ انسان کے لیے ایک نہایت مثبت ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ تنہائی انسان کی سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو بہتر بناتی ہے۔

وہ کسی بھی معاملے کو صرف اس کے موجودہ پہلو سے نہیں دیکھتا بلکہ اس کے ممکنہ نتائج پر بھی غور کرتا ہے۔ یہی عادت انسان میں بصیرت پیدا کرتی ہے اور اسے جلد بازی کے بجائے سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے کی طرف مائل کرتی ہے۔

ہمیں کبھی یہ بھی سوچنا چاہیے کہ یہ کائنات کتنی وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم تخلیق فرمائی ہے جس کا مکمل ادراک آج تک انسان بھی نہیں کر سکا۔

یہ زمین، آسمان، سیارے اور بے شمار مخلوقات سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہماری سوچ سے کہیں زیادہ وسیع اور عظیم ہے۔

لیکن ہم میں سے اکثر لوگ اپنی زندگی کی چند پریشانیوں اور محدود حالات سے آگے سوچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

ہماری نظر صرف اپنے گرد گھومنے والے مسائل تک محدود رہ جاتی ہے، جبکہ حقیقت اس سے کہیں بڑی ہوتی ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ایک مینڈک پوری زندگی ایک گہرے کنویں میں رہے تو اس کے لیے وہی کنواں پوری دنیا بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ کنویں کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک محدود رہتی ہے۔ اس نے نہ کبھی سمندر دیکھا ہوتا ہے، نہ دریاؤں کی وسعت، اور نہ ہی اسے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس محدود دنیا سے باہر بھی ایک بہت بڑی کائنات موجود ہے۔

اگر کوئی اسے سمندر کی وسعت کے بارے میں بتائے تو شاید وہ اس پر یقین بھی نہ کرے، کیونکہ اس کا تجربہ صرف اسی کنویں تک محدود ہے۔

کچھ انسان بھی اسی طرح اپنی سوچ کو چند حالات، چند لوگوں اور چند واقعات تک محدود کر لیتے ہیں۔

پھر کسی کا ایک رویہ، ایک ناکامی یا ایک تکلیف ان کی پوری زندگی پر حاوی ہو جاتی ہے۔

وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا ان چند واقعات سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اور زندگی میں سیکھنے، سمجھنے اور آگے بڑھنے کے بے شمار مواقع موجود ہیں۔

جب انسان تنہائی میں بیٹھ کر اس کائنات، اپنی زندگی اور اپنے مقصد پر غور کرتا ہے تو اس کی سوچ وسیع ہونے لگتی ہے۔

وہ اپنے مسائل کو ایک نئے زاویے سے دیکھتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ جن باتوں کو وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھ رہا تھا، وہ دراصل اس وسیع نظامِ کائنات کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہیں۔

ایسی تنہائی انسان کو صرف اپنی ذات ہی نہیں، بلکہ انسانی نفسیات کو بھی بہتر انداز میں سمجھنا سکھاتی ہے۔

وہ لوگوں کے رویوں کو ذاتی انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے ان کے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے اندر مشاہدہ، برداشت اور بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

پھر اگر کوئی اس کے ساتھ ناانصافی یا کم ظرفی کا مظاہرہ بھی کرے تو وہ اس ایک واقعے کو اپنی پوری زندگی پر مسلط نہیں ہونے دیتا، بلکہ سبق سیکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی غور و فکر کا ایک اور اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے فیصلوں کے بارے میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو جاتا ہے۔ جب انسان تنہا ہوتا ہے اور کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ خود سے یہ سوال ضرور کرتا ہے کہ اگر میں یہ قدم اٹھاؤں تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس فیصلے کے نتائج کیا ہوں گے، اور اگر حالات میرے مطابق نہ رہے تو کیا میں ان کا سامنا کر سکوں گا؟

اس کے برعکس، جب انسان ہر وقت دوسروں کے سہارے کا عادی ہو جائے تو بعض اوقات وہ اتنی گہرائی سے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

اس کے دل میں ایک اطمینان سا ہوتا ہے کہ اگر کوئی مشکل آ بھی گئی تو کوئی نہ کوئی اس کے ساتھ ہوگا۔ لیکن تنہائی انسان کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے۔

وہ اپنے ہر فیصلے کے نتائج پر پہلے سے زیادہ غور کرتا ہے، اور یہی عادت اس کے اندر پختگی اور دوراندیشی پیدا کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں تنہائی کو سزا نہیں سمجھتی۔ اگر اسے درست زاویے سے دیکھا جائے تو تنہائی سزا نہیں، بلکہ شعور پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

ہاں، اگر تنہائی مایوسی، ناامیدی اور خود کو دنیا سے کاٹ لینے کا نام بن جائے تو وہ یقیناً انسان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اصل سزا تنہائی نہیں، بلکہ مایوسی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بہت سی مؤثر اور باوقار شخصیات ضرورت سے زیادہ بولنے کے بجائے خاموش رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔

ان کی خاموشی کمزوری نہیں ہوتی، بلکہ سوچ، مشاہدے اور گہرے شعور کی علامت ہوتی ہے۔

ایسے لوگ الفاظ سے زیادہ اپنے کردار اور اپنے فیصلوں سے پہچانے جاتے ہیں، کیونکہ وہ بولنے سے پہلے

سوچتے ہیں، اور فیصلہ کرنے سے پہلے اس کے نتائج کا اندازہ لگاتے ہیں۔

خاموشی اور تنہائی، اگر شعور کے ساتھ اختیار کی جائیں، تو انسان کی شخصیت میں وقار، گہرائی اور مضبوطی پیدا کر دیتی ہیں۔

لیکن ان تمام باتوں کے بعد ایک سوال اب بھی باقی رہ جاتا ہے، اور شاید یہی اس پورے باب کا سب سے اہم سوال ہے۔

اگر تنہائی ہر حال میں سزا نہیں، تو پھر انسان تنہائی سے بھاگتا کیوں ہے؟ آخر اسے تنہا رہنے سے اتنا خوف کیوں محسوس ہوتا ہے؟

ذرا ایک لمحے کے لیے تصور کیجیے کہ آج آپ سے آپ کا موبائل، آپ کے دوست، آپ کی مصروفیات اور وہ تمام چیزیں چھین لی جائیں جن میں آپ روز خود کو الجھائے رکھتے ہیں، اور آپ سے کہا جائے کہ کچھ وقت صرف اپنے ساتھ گزاریے۔

کیا آپ یہ کر پائیں گے؟

کیا آپ کے اندر اتنی برداشت ہے کہ آپ بغیر کسی سہارے، بغیر کسی مصروفیت اور بغیر کسی شور کے کچھ وقت اپنے ساتھ گزار سکیں؟

شاید بہت سے لوگ کسی چیلنج یا مجبوری کے تحت یہ وقت گزار لیں، لیکن اگر انہیں اپنی مرضی سے تنہائی اختیار کرنے کا کہا جائے تو وہ اس سے بچنے کی کوشش کریں گے۔

آخر ایسا کیوں ہے؟

شاید اس لیے کہ تنہائی میں انسان کا سامنا سب سے پہلے اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ وہ شور، جس میں وہ روز خود کو مصروف رکھتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنے ان سوالوں کے سامنے کھڑا ہوتا ہے جن سے وہ مدتوں سے بچتا آیا ہوتا ہے۔

بعض اوقات ہم لوگوں سے نہیں، بلکہ اپنے ہی خیالات سے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ ہم اپنی کمزوریوں، اپنی غلطیوں، اپنے خوف اور اپنے ادھورے پن کو دیکھنے سے گھبراتے ہیں۔

اس لیے ہم خود کو ہر وقت کسی نہ کسی مصروفیت میں الجھائے رکھتے ہیں تاکہ ہمیں خود سے ملنے کا موقع ہی نہ ملے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان اپنی ذات سے ملنے کا حوصلہ پیدا نہیں کرتا وہ اپنی ذات کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ اور جو شخص خود کو نہیں سمجھتا، وہ اپنی زندگی، اپنے فیصلوں اور اپنے مقصد کو بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔

اس لیے تنہائی خود کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ اسے دیکھنے کا ہمارا زاویۂ نظر اس کے معنی بدل دیتا ہے۔ ایک ہی تنہائی کسی انسان کو مایوسی کی طرف لے جا سکتی ہے، اور یہی تنہائی کسی دوسرے انسان کے لیے خود شناسی، غور و فکر اور بہتری کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

اکثر اوقات چیزیں اپنی اصل میں اتنی اہم نہیں ہوتیں جتنا ہمارا طرزِ فکر انہیں اہم بنا دیتا ہے۔ جس طرح ہم کسی انسان سے پہلی ملاقات میں اس کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتے ہیں، حالانکہ وہ رائے ہمیشہ حقیقت نہیں ہوتی اسی طرح تنہائی کا مطلب بھی ہر انسان اپنی سوچ کے مطابق متعین کرتا ہے۔

اس لیے شاید تنہائی کو بدلنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے دیکھنے کے زاویے کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

❖ باب چہارم ❖

ادھورا آئینہ

اس موضوع پر بات شروع کرنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آخر حسد ہے کیا؟

آپ کے نزدیک حسد کیا ہے؟ کیا کسی انسان سے نفرت کرنا حسد ہے؟ یا اس کی دولت، آسائش، کامیابی یا قابلیت سے نفرت کرنا حسد کہلاتا ہے؟ آخر حسد کی حقیقت کیا ہے؟

کیونکہ حسد ہی وہ بیج ہے جس سے موازنہ جنم لیتا ہے، اور پھر انسان اپنی ذات کو دوسروں کے ترازو میں تولنا شروع کر دیتا ہے۔

مگر میرے نزدیک ان میں سے کوئی بھی حسد کی مکمل تعریف نہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ حسد کسی دوسرے انسان یا اس کی نعمتوں سے نفرت کا نام نہیں، بلکہ اپنے اندر موجود اس

کمی سے نفرت کا نام ہے جو ہمیں اس مقام تک پہنچنے نہیں دیتی جہاں دوسرا کھڑا ہے۔

جب ہم کسی دوسرے کے پاس کوئی نعمت، قابلیت یا کامیابی دیکھتے ہیں اور وہ ہمارے پاس نہیں ہوتی، تو حقیقت میں ہم اس انسان سے نہیں بلکہ اپنی اس کمی سے نفرت کر رہے ہوتے ہیں جو ہمیں وہاں تک پہنچنے سے روکتی ہے۔

اور اگر وہ چیز ہمارے پاس موجود بھی ہو، لیکن پھر بھی ہمیں کسی سے حسد ہو، تو شاید اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم دوسروں کی برتری یا زیادہ کامیابی کو قبول نہیں کر پاتے۔

ایسی صورت میں حسد ہماری کسی کمی سے زیادہ، ہمارے نفس کی اس خواہش کا اظہار بن جاتا ہے جو ہر حال میں خود کو دوسروں سے بہتر دیکھنا چاہتی ہے۔

اگر کوئی انسان واقعی اپنی قابلیت پر یقین رکھتا ہو، تو وہ کبھی کسی دوسرے انسان کی دولت، آسائش، کامیابی یا قابلیت سے نفرت نہیں کرے گا۔ وہ نہ صرف اسے اپنے لیے خطرہ نہیں سمجھے گا بلکہ دوسروں کو بھی یہی

حوصلہ دے گا کہ اگر ایک انسان یہ مقام حاصل کر سکتا ہے تو دوسرا بھی کر سکتا ہے۔

وہ لوگوں کو یہ احساس دلائے گا کہ کامیابی کسی ایک شخص کی میراث نہیں، بلکہ ہر اس انسان کا حق ہے جو اس کے لیے محنت کرنے کو تیار ہو۔

لیکن اگر کوئی شخص خود اس مقام تک پہنچنے کی ہمت، ارادہ یا خواہش ہی نہ رکھتا ہو، تو پھر وہ آہستہ آہستہ اس انسان سے نفرت کرنے لگتا ہے جس کے پاس وہ نعمت موجود ہوتی ہے۔

مگر میرے نزدیک حقیقت میں وہ اس شخص سے نہیں، بلکہ اپنی اس نااہلی، کمزوری یا بے عملی سے نفرت کر رہا ہوتا ہے جسے ہمارا معاشرہ حسد کا نام دے دیتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ایسا انسان دوسروں کو آگے بڑھنے کی ترغیب بھی نہیں دے پاتا۔

وہ حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے کامیاب انسان کی کامیابی میں خامیاں تلاش کرتا ہے، اس پر الزام لگاتا ہے یا اس کی کامیابی کو کم تر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے،

کیونکہ دوسروں کی روشنی اسے اپنی تاریکی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔

تب اس انسان کی نااہلی یا کمزوری اپنے پست ترین مقام پر پہنچ جاتی ہے، جب وہ خود کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دوسروں کو غلط ثابت کرنے لگتا ہے۔

حالانکہ حقیقت میں اس معاملے میں دوسروں کا کوئی قصور نہیں ہوتا، مگر وہ اپنی سوچ اور اپنے نظریے کو درست ثابت کرنے کے لیے دوسروں کی برائی کا سہارا لیتا ہے۔ اسے اپنی اچھائی دکھانے کے لیے دوسروں کو کمتر ثابت کرنا پڑتا ہے۔

شاید یہی حسد کی اصل شکل ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے موازنہ جیسے خطرناک خیالات جنم لینا شروع ہوتے ہیں۔

لیکن کیا ہر موازنہ نقصان دہ ہوتا ہے؟

میرے نزدیک موازنہ بنیادی طور پر تین طرح کا ہوتا ہے۔

پہلا موازنہ وہ ہے جو ہم اپنے سے کم تر لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

دوسرا موازنہ وہ ہے جو ہم اپنے سے بلند مقام رکھنے والے لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

اور تیسرا موازنہ وہ ہے جس کا مقصد خود کو اور دوسروں کو بہتر بننے کی ترغیب دینا ہوتا ہے۔

سب سے پہلے اپنے سے کم تر لوگوں کے ساتھ موازنہ کرنے کی بات کرتے ہیں۔

یہ موازنہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی ایسا شخص، جسے ہم کبھی خود سے کم سمجھتے تھے، محنت، قسمت یا اللہ کی عطا سے کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

ایسے میں بعض لوگوں کے دل میں ایک غیر اخلاقی خیال جنم لیتا ہے کہ آخر وہ کامیاب کیسے ہو گیا؟ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اس شخص نے اپنی محنت، اپنے حالات یا اپنے نصیب کے مطابق وہ مقام حاصل کیا ہوتا ہے۔

ایسے موازنے کا انجام اکثر حسد، نفرت اور دل کی بے سکونی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اب بات کرتے ہیں اپنے سے بلند مقام رکھنے والے لوگوں کے ساتھ موازنے کی۔

یہ موازنہ بھی دو مختلف صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔

پہلی صورت مثبت ہے۔ اس میں انسان کسی کامیاب شخص کو دیکھ کر خود کو یہ یقین دلاتا ہے

کہ اگر وہ یہ مقام حاصل کر سکتا ہے تو میں بھی محنت، صبر اور مستقل مزاجی کے ذریعے وہاں تک پہنچ سکتا ہوں۔ ایسا موازنہ انسان کو آگے بڑھنے، سیکھنے اور اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کی ترغیب دیتا ہے۔

جبکہ دوسری صورت منفی ہے۔ اس میں انسان دوسرے کی کامیابی دیکھ کر احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔

وہ خود سے کہنے لگتا ہے کہ "میں کبھی اس جیسا نہیں بن سکتا"، "میرے اندر وہ صلاحیت نہیں"، یا "میری قسمت ہی خراب ہے۔

" اس طرح موازنہ ترقی کا ذریعہ بننے کے بجائے انسان کے اعتماد، سکون اور شخصیت کو آہستہ آہستہ کھوکھلا کرنے لگتا ہے۔

یوں دیکھا جائے تو موازنہ صرف دوسروں سے نہیں، بلکہ اکثر اپنی ذات سے ناانصافی کا بھی سبب بن جاتا ہے۔

اصل میں موازنہ اور حسد کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم کسی انسان کی صرف ظاہری زندگی کو دیکھتے ہیں۔ ہر انسان کی اپنی ایک ذاتی زندگی ہوتی ہے۔

ہر شخص اپنے اپنے انداز سے زندگی گزار رہا ہوتا ہے، مگر وہ دنیا کو صرف اتنا ہی دکھاتا ہے جتنا وہ خود دکھانا چاہتا ہے۔

وہ اپنی زندگی کو صرف اتنی ہی حد تک دوسروں کے سامنے آنے دیتا ہے جتنی اس کی مرضی ہوتی ہے۔

لیکن ہم اس کی صرف ظاہری زندگی کو دیکھ کر اپنی پوری زندگی کا اس سے موازنہ کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور شاید یہی خیال ہمیں بگاڑ کی طرف لے جاتا ہے۔

اگر حقیقت کو دیکھا جائے تو اس دنیا میں کوئی بھی انسان مکمل نہیں۔ اگر کسی کے پاس دولت ہے تو ممکن ہے وہ صحت سے محروم ہو۔

اگر کسی کے پاس دولت بھی ہے اور صحت بھی، تو شاید وہ اولاد کی نعمت سے محروم ہو۔ اگر کسی کے پاس

دولت، صحت اور اولاد تینوں موجود ہوں، تو ممکن ہے وہ سکونِ قلب سے محروم ہو۔ اور اگر بظاہر اس کے پاس یہ سب کچھ بھی موجود ہو، تو شاید وہ کسی اور ایسی نعمت سے محروم ہو جس کا ہمیں اندازہ بھی نہ ہو۔

اس لیے ہر انسان اپنی زندگی میں کسی نہ کسی محاذ پر ایک جنگ لڑ رہا ہوتا ہے۔

کچھ لوگ اپنی تکلیفوں کو دنیا کے سامنے بیان کر دیتے ہیں۔ شاید انہیں یہ امید ہوتی ہے کہ دنیا ان کی خیرخواہ ثابت ہوگی یا ان کے درد کو سمجھ لے گی۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیا آج تک کسی کی مستقل خیرخواہ نہیں بنی۔ زیادہ سے زیادہ لوگ چند لمحوں کی ہمدردی کا اظہار کر دیتے ہیں، "اللہ آپ کے حالات بہتر کرے" یا "مجھے آپ کے لیے بہت افسوس ہوا" جیسے چند الفاظ کہہ دیتے ہیں، مگر ان الفاظ سے آگے بڑھ کر اکثر کوئی انسان دوسرے کے دکھ اپنے کندھوں پر نہیں اٹھا سکتا۔

اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی تکلیفوں کو اپنے دل میں چھپا لیتے ہیں۔

ان کی زندگی میں بہت کچھ چل رہا ہوتا ہے، مگر وہ دنیا کے سامنے مسکراتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اپنی آزمائش کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

ایسے لوگوں کو دیکھ کر ہم ان کی صرف ظاہری خوش حالی کو دیکھتے ہیں اور اپنی زندگی کا ان سے موازنہ کرنا شروع کر دیتے ہیں،

حالانکہ ہمیں ان کی زندگی کے پسِ پردہ چلنے والی کہانی کا ذرہ برابر بھی علم نہیں ہوتا۔

شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کبھی مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ہمارے سامنے اپنے دکھ بیان کرے تو ہم زیادہ سے زیادہ اس سے ہمدردی کے چند الفاظ کہہ دیتے ہیں، مگر اکثر اس کی عملی مدد نہیں کر پاتے۔

اور اگر کوئی اپنے دکھ چھپا کر مطمئن زندگی گزارتا ہوا دکھائی دے، تو ہم اس سے موازنہ شروع کر دیتے ہیں۔

گویا ہم نہ کسی کو دکھی دیکھ کر مکمل مطمئن ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی کو خوش حال دیکھ کر۔

حالانکہ ان دونوں صورتوں میں نقصان صرف ہمارا اپنا ہوتا ہے۔ جس انسان پر آزمائش آئی ہے، وہ تو بہرحال اس آزمائش کو برداشت کرے گا، کیونکہ اسی کا نام زندگی ہے۔

اگر انسان کی زندگی میں کبھی کوئی دکھ، مشکل یا آزمائش نہ آئے، تو پھر یہ دنیا جنت بن جائے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا آزمائش کا گھر ہے۔

ہر انسان پر آزمائش ضرور آتی ہے، مگر ہر ایک کی آزمائش کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ کسی کا بچپن مشکلات میں گزرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بعد میں اسے عزت اور کامیابی عطا کر دیتا ہے۔

جبکہ بعض لوگوں کا بچپن خوش حالی میں گزرتا ہے، مگر ان کی جوانی یا بڑھاپا ان کی آزمائش کا سبب بن جاتا ہے۔

اسی طرح کسی کو بیماری کے ذریعے آزمایا جاتا ہے، کسی کو اولاد کی محرومی کے ذریعے، کسی کو غربت کے ذریعے، اور کسی کو رشتوں کی مشکلات کے ذریعے۔

لیکن ایک آزمائش ایسی بھی ہے جسے اکثر لوگ آزمائش سمجھتے ہی نہیں، حالانکہ شاید وہ سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے، اور وہ ہے دولت، عزت، شہرت اور بے شمار

نعمتوں کا مل جانا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کبھی انسان کو محرومی دے کر آزماتا ہے، اور کبھی نعمتوں کی فراوانی عطا کر کے۔

انسان اکثر یہ کہتا ہے کہ "کاش میرے پاس یہ نعمت ہوتی تو میں بہت شکر گزار ہوتا، میں یہ بھی کرتا اور وہ بھی کرتا۔" مگر جب اللہ تعالیٰ اسے وہ نعمت عطا کر دیتا ہے، تب اس کے شکر، صبر اور کردار کا اصل امتحان شروع ہوتا ہے۔

اسی لیے جب ہم دوسروں کی زندگی کو دیکھ کر اپنی زندگی کا موازنہ کرتے ہیں، تو درحقیقت ہم خود اپنے ساتھ ناانصافی کر رہے ہوتے ہیں۔

کیونکہ ہم اپنی پوری زندگی کا موازنہ کسی دوسرے کی صرف اس ظاہری تصویر سے کر رہے ہوتے ہیں، جس کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت سے ہم بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔

لیکن اگر موازنہ ان تمام وجوہات کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، تو پھر سوال یہ ہے کہ آخر موازنہ انسان کو تباہ کیوں کر دیتا ہے؟

ذرا سوچیے، جب آپ اپنی زندگی سے زیادہ کسی اور کی زندگی، کسی اور کی کامیابی اور کسی اور کے معاملات کو اہمیت دینا شروع کر دیتے ہیں، تو درحقیقت آپ اپنی زندگی سے توجہ ہٹا کر کسی ایسی حقیقت کے پیچھے چل پڑتے ہیں جسے آپ پوری طرح جانتے ہی نہیں۔

آپ صرف کسی انسان کی ظاہری زندگی کو دیکھتے ہیں اور اسی ادھوری تصویر کو اپنی پوری زندگی کے ساتھ ملا کر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

شاید اگر آپ کو اس انسان کی پوری زندگی، اس کی قربانیوں، اس کے دکھوں، اس کی آزمائشوں اور ان خامیوں کا علم ہو جن کے ساتھ وہ روز جیتا ہے، تو ممکن ہے آپ کبھی بھی اس جیسا بننے کی خواہش نہ کریں۔

کیونکہ ہر انسان اپنی زندگی میں کسی نہ کسی ایسے درد کو اٹھائے ہوئے ہوتا ہے جس کا اندازہ صرف اسے اور اس کے رب کو ہوتا ہے۔

ہر کامیابی کے پیچھے ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جو ہر آنکھ کو نظر نہیں آتی۔

اصل مسئلہ یہ نہیں کہ ہم دوسروں کو دیکھتے ہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان کی پوری زندگی نہیں، صرف ایک ادھورا آئینہ دیکھتے ہیں، اور پھر اپنی پوری زندگی کا موازنہ اس ادھورے آئینے سے کرنے لگتے ہیں۔

وہ بھی اپنے آپ کو بہتر بنانے کے لیے نہیں، بلکہ خود کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے یا اپنے دل میں حسد پیدا کرنے کے لیے۔

ایسا موازنہ نہ صرف انسان کی سوچ کو محدود کر دیتا ہے بلکہ اس کی شخصیت کو بھی آہستہ آہستہ کھوکھلا کر دیتا ہے۔

پھر وہ نہ کسی دوسرے کی کامیابی سے آگے سوچ پاتا ہے اور نہ اپنی کامیابی کے لیے محنت کر پاتا ہے۔

وہ دوسروں کے پاس موجود نعمتوں کو دیکھنے میں اتنا مصروف ہو جاتا ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے اور انہیں نکھارنے کا وقت ہی نہیں نکال پاتا۔

اس سب کا نقصان کبھی دوسرے انسان کو نہیں ہوتا، بلکہ سب سے زیادہ نقصان خود اس شخص کی ذات کو پہنچتا

ہے۔ اس کی شخصیت متاثر ہوتی ہے، اس کے خواب مدھم پڑ جاتے ہیں، اس کی منزل دھندلا جاتی ہے، اور جب انسان اپنی منزل ہی بھول جائے تو زندگی کا مقصد بھی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتا ہے۔

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسد اور موازنہ جیسے ان منفی خیالات سے نجات کیسے حاصل کی جائے؟

میرے نزدیک اس کا حل اتنا مشکل نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان اپنی توجہ دوسروں کی زندگی سے ہٹا کر اپنی زندگی پر مرکوز کرنا سیکھ لے۔

اگر ہم توکل کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں، اپنی آزمائشوں کو صبر اور شکر کے ساتھ قبول کرنا سیکھ لیں اور یہ حقیقت سمجھ لیں کہ دنیا میں کوئی بھی انسان مکمل نہیں، تو شاید موازنہ خود بخود اپنی شدت کھو دے۔

یہ دنیا ہی نامکمل ہے، اس لیے اس میں رہنے والا ہر انسان بھی کسی نہ کسی اعتبار سے نامکمل ہے۔

ہر شخص کے پاس کوئی نہ کوئی نعمت ہے اور ہر شخص کسی نہ کسی نعمت سے محروم بھی ہے۔ یہی دنیا کی حقیقت ہے۔

یہاں تک کہ ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے، ایک ہی گھر میں پلنے والے اور ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھانے والے بہن بھائیوں کی قسمتیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔

کوئی زندگی میں بہت بلند مقام حاصل کر لیتا ہے، جبکہ کوئی اپنی زندگی کے مشکل ترین دنوں کا سامنا کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر انسان کی کہانی دوسرے انسان سے مختلف ہوتی ہے۔

اگر انسان صرف اس ایک حقیقت کو سمجھ لے کہ زندگی آزمائش کا نام ہے، ہر انسان اپنی الگ آزمائش سے گزر رہا ہے، اور کوئی بھی مکمل نہیں، تو اس کے دل میں منفی موازنہ اور حسد جیسے خیالات شاید کبھی جنم ہی نہ لیں۔

البتہ مثبت موازنہ ہمیشہ فائدہ مند ہے۔

اگر کبھی ہم سستی، کاہلی یا مایوسی کا شکار ہو جائیں، تو ہمیں ان لوگوں کو دیکھنا چاہیے جنہوں نے محنت، صبر اور وقت کی قدر سے اپنی زندگی بدل لی۔

ہمیں ان ہستیوں سے سیکھنا چاہیے جنہوں نے انسانیت کے لیے بہترین مثالیں قائم کیں۔ ایسا موازنہ ہمیں احساسِ کمتری نہیں دیتا بلکہ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

پھر نہ صرف ہم اپنی زندگی بہتر بناتے ہیں بلکہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو بھی امید، محنت اور ترقی کی راہ دکھانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم صرف اس ایک حقیقت کو اپنے دل میں بٹھا لیں کہ کسی بھی انسان کی زندگی کا صرف ادھورا آئینہ دیکھ کر ہمیں اپنی زندگی کی نعمتوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی خود کو احساسِ کمتری یا حسد کا شکار بنانا چاہیے

تو شاید ہم کبھی منفی موازنے اور حسد جیسے زہریلے جذبات میں مبتلا نہ ہوں۔

شاید زندگی کو پُرسکون بنانے کے لیے صرف یہی دو باتیں کافی ہیں؛ اپنی نعمتوں کی قدر کرنا، اور دوسروں کی

ادھوری تصویر دیکھ کر اپنی مکمل زندگی کا فیصلہ نہ کرنا۔

❖ باب پنجم ❖

دل کی چاہت یا رب کی حکمت؟

ہر انسان اپنے اندر خواہشات کا ایک وسیع سمندر سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ خواہ وہ انہیں پورا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، اس کے دل میں کسی نہ کسی خواہش کا جنم ضرور ہوتا ہے۔

یہ خواہشات ایک جیسی نہیں رہتیں بلکہ وقت کے ساتھ بدلتی، بڑھتی اور نئی شکلیں اختیار کرتی رہتی ہیں۔

انسان کی بعض خواہشات ایسی ہوتی ہیں جنہیں پورا کرنے کے وسائل اس کے پاس موجود نہیں ہوتے۔

مگر اس کے باوجود وہ اس کے دل میں کبھی منزل بن کر، کبھی حسرت بن کر، کبھی امید بن کر اور کبھی ایک مضبوط محرک بن کر زندہ رہتی ہیں۔

وہ اسے آگے بڑھنے، جدوجہد کرنے اور اپنی موجودہ حالت سے بہتر مقام حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

دوسری جانب وہ لوگ جو اپنی خواہشات کو حقیقت کا روپ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان کی خواہشات بھی کسی ایک حد پر آ کر ختم نہیں ہوتیں۔

جیسے جیسے ان کی زندگی میں ترقی، آسائش اور کامیابیاں بڑھتی جاتی ہیں، ویسے ویسے نئی خواہشات جنم لیتی رہتی ہیں۔

ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو اس کی جگہ دوسری لے لیتی ہے، اور دوسری کے بعد تیسری۔

شاید یہی وجہ ہے کہ خواہشات کی بھوک کبھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوتی۔ انسان کے پاس وسائل ہوں یا نہ ہوں، اس کے دل میں کچھ پانے، کچھ حاصل کرنے اور کچھ بننے کی آرزو ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتی ہے۔

خواہشات انسان کی فطرت کا حصہ ہیں، اور یہی خواہشات اکثر اسے حرکت، جدوجہد اور تبدیلی کی طرف لے جاتی ہیں۔

سب سے پہلے خواہشات کے اصل مطلب کو سمجھنا ضروری ہے۔ آخر خواہش ہوتی کیا ہے؟ کیا خواہش کسی ایک چیز کو مستقل چاہتے رہنے کا نام ہے، یا پھر کسی چیز کو حاصل کر لینے کے بعد اس کی چاہت ختم ہو جانے کو خواہش کہتے ہیں؟ آخر خواہشات کی حقیقت کیا ہے؟

یہ تو طے ہے کہ انسان کی خواہشات لامحدود ہوتی ہیں۔

وہ نہ جانے کتنے ہی پہلوؤں میں اس کے سامنے جنم لیتی رہتی ہیں، اور شاید انسان کی تمام خواہشات کبھی بھی مکمل طور پر پوری نہیں کی جا سکتیں، کیونکہ یہ ایک ایسی بھوک ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔

اصل میں میرے نزدیک خواہش کا مطلب کسی چیز کو صرف چاہنا نہیں، بلکہ اسے حاصل کر لینے کے بعد بھی اس کی چاہت کا باقی رہنا ہے۔

ہو سکتا ہے ہر انسان کے نقطۂ نظر کے مطابق اس کی تعریف مختلف ہو، لیکن میری نظر میں جس چیز کو حاصل کر لینے کے بعد اس کی چاہت ختم ہو جائے، وہ خواہش نہیں بلکہ طلب ہوتی ہے۔

طلب پوری ہو جائے تو اس کی کشش بھی ختم ہو جاتی ہے، مگر خواہش کا مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔

ذرا تصور کیجیے کہ آپ کی ایک اچھی ملازمت لگ جاتی ہے اور آپ کا معیارِ زندگی پہلے سے دس گنا بہتر ہو جاتا ہے۔ کافی عرصے سے آپ کا خواب تھا کہ اپنی ذاتی کمائی سے ایک خوبصورت، دو یا تین منزلہ گھر بنائیں۔

پھر ایک دن آپ کی ملازمت لگ جاتی ہے، آمدنی شروع ہو جاتی ہے اور کچھ عرصے بعد آپ اتنے وسائل جمع کر لیتے ہیں کہ اپنا یہ خواب پورا کر سکیں۔

بظاہر آپ کی خواہش پوری ہو گئی، لیکن کیا آپ پوری زندگی اسی گھر پر مطمئن رہیں گے؟

شاید نہیں۔ وہ گھر آپ کی اپنی محنت اور کمائی سے پوری ہونے والی پہلی بڑی چاہت ضرور ہوگا، لیکن جیسے جیسے آپ کا معیارِ زندگی بلند ہوتا جائے گا، دولت میں اضافہ ہوتا جائے گا اور حالات بدلتے جائیں گے، ویسے ویسے آپ کی نظر اس سے بھی بہتر گھر، بہتر آسائشوں

اور مزید سہولیات پر پڑنے لگے گی۔ یہاں سے ایک نئی طلب جنم لے گی۔ق

اسی لیے میرے نزدیک ہماری زندگی میں جن چیزوں کو ہم اکثر خواہشات کا نام دیتے ہیں، ان میں سے بہت سی دراصل طلب ہوتی ہیں۔ وہ پوری ہوتے ہی اپنی کشش کھو دیتی ہیں، جبکہ خواہش کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع اور مسلسل ہوتا ہے۔

اور سب سے بڑی بات، جس کا ذکر میں یہاں کرنا چاہوں گی، یہ ہے کہ کیا ہم نے کبھی خود سے یہ سوال کیا ہے کہ کیا ہماری اپنے لیے کی جانے والی ہر خواہش ہمارے لیے فائدہ مند ہوتی ہے؟

شاید نہیں۔

اسی وجہ سے ہم اپنی خواہش کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، بار بار کوشش کرتے ہیں، اور اگر وہ کام نہیں ہو پاتا تو پھر ہم اس کا قصوروار قسمت کو ٹھہرانے لگ جاتے ہیں، بجائے اس کے کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ شاید وہ چیز ہمارے لیے بہتر ہی نہ ہو۔

ممکن ہے جس چیز کو ہم اپنی خوشی یا کامیابی سمجھ رہے ہوں، وہ ہمارے حق میں نہ ہو، اور جس چیز کے نہ ملنے پر ہم افسوس کر رہے ہوں، اسی میں ہمارے لیے بھلائی پوشیدہ ہو۔

لیکن چونکہ انسان اپنی خواہش کو ہی حقیقت سمجھ لیتا ہے، اس لیے جب وہ پوری نہیں ہوتی تو وہ اس کا ذمہ دار اپنی قسمت کو ٹھہرا دیتا ہے، حالانکہ ضروری نہیں کہ ہماری ہر چاہی ہوئی چیز ہمارے لیے فائدہ مند بھی ہو۔

یہ بھی ہے کہ ہر خواہش کا زندگی میں پورا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ کچھ خواہشات کو انسان کو مسکرا کر چھوڑنا پڑتا ہے، کیونکہ یہ زندگی ہے، اور زندگی کبھی بھی ہمارے پلان کے مطابق نہیں چلتی۔

ہم کچھ سوچتے ہیں، لیکن ہوتا کچھ اور ہے۔

بعض اوقات ہم کچھ خواہشات کے پیچھے اس قدر پاگل ہو چکے ہوتے ہیں، یا پھر انہیں اپنی زندگی میں اتنی سنجیدگی سے مقام دے لیتے ہیں کہ ہم کہتے ہیں: "اگر یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو شاید میرے جینے کا مقصد ہی نہیں رہے گا۔" یا پھر "یہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو لازماً پوری ہونی چاہیے۔"

حالانکہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی کہ وہ چیز ہمارے لیے فائدہ مند بھی ہے یا نہیں۔ ہمیں اس بات کا کچھ بھی پتہ نہیں ہوتا، لیکن یہ نہ جانتے ہوئے بھی ہم بار بار کوشش کرتے رہتے ہیں کہ میری یہ خواہش پوری ہو جائے، مجھے یہ چیز حاصل ہو جائے۔

پھر جب وہ چیز ہمیں حاصل نہیں ہوتی تو ہم سب سے پہلا قصوروار اپنی قسمت کو ٹھہراتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں: "میں نے تو اسے حاصل کرنے کی بہت کوشش کی، مگر میری قسمت بہت خراب ہے۔"

کیا یہ کہنا درست ہے کہ "میری قسمت خراب ہے؟" یقیناً یہ بہت غلط ہے۔

قسمت کو لکھنے والا کون ہے؟ وہ اللہ، جو ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندے سے محبت کرتا ہے۔ کیا وہ آپ کی پچاس یا ساٹھ سال کی اس مختصر سی زندگی میں آپ کو خسارہ دے گا؟ کیا وہ آپ کو بلا مقصد تکلیف دے گا؟ کیا وہ ایسی چیز آپ کو دے گا جو آپ کے لیے فائدہ مند نہ ہو؟ یا پھر جو چیز واقعی آپ کے لیے فائدہ مند ہوگی، کیا وہ اسے آپ تک پہنچنے سے روک دے گا؟

یقیناً ایسا نہیں ہے، کیونکہ آپ کے بارے میں جتنا علم آپ کے پیدا کرنے والے، یعنی اللہ تعالیٰ کو ہے، اتنا علم آپ کو خود اپنے بارے میں بھی نہیں۔ جو اللہ آپ کے بارے میں جانتا ہے، وہ آپ خود بھی اپنے بارے میں نہیں جانتے۔ جو اللہ جانتا ہے کہ لوگ آپ کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں، وہ بھی آپ نہیں جانتے۔ اور جو اللہ جانتا ہے کہ آپ کی خواہش آپ کے لیے کس قدر فائدہ مند ہے یا کس قدر نقصان پہنچا سکتی ہے، وہ بھی آپ نہیں جانتے۔

آپ کے دل میں جو خواہش، یا یوں کہیے کہ جس چیز نے طلب کے نام سے جنم لیا ہے، آپ کو یہ نہیں معلوم کہ اسے حاصل کرنے کے لیے آپ کو کیا کچھ کرنا پڑے گا، یا پھر اسے حاصل کرنے کے بعد بھی آپ کو حقیقی تسکین حاصل ہو پائے گی یا نہیں۔

یہ تمام چیزیں صرف اور صرف اللہ جانتا ہے، آپ نہیں جان سکتے۔

لیکن جب بھی ہمیں کوئی چیز نہیں ملتی، یا ہماری کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی، تو ہم بہت ساری شکایتیں کرنے لگتے ہیں۔ اکثر لوگ تہجد میں بھی رو رو کر مانگ رہے ہوتے ہیں، لیکن اگر ان کی وہ دعا قبول نہیں ہوتی تو ان کا

تہجد سے یقین اٹھنے لگتا ہے، یا پھر ان نوافل، عبادات اور دعاؤں سے ان کا یقین کمزور ہونے لگتا ہے۔

وہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ "جو قسمت میں نہیں ہوتا، وہ کبھی نہیں ملتا۔"

حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ اگر آپ کے لیے ایک چیز نقصان دہ ہے، اگر وہ آپ کے لیے بہتر نہیں ہے، تو کیا پوری دنیا میں آپ کے لیے ہر چیز ہی نقصان دہ ہوگی؟ کیا اس وسیع دنیا میں آپ کے لیے کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہوگی جو آپ کے حق میں بہتر ہو؟

یقیناً ایسا نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے لیے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا، اور جو چیز آپ واقعی ڈیزرو کرتے ہیں، وہ آپ کو مل کر ہی رہے گی۔

دعاؤں سے یقین اٹھ جانا، عبادت سے دل برداشتہ ہو جانا، یا اپنی قسمت سے گلہ شکوہ کرنا، یہ وہ کام ہیں جو ہم سب سے پہلے کرتے ہیں، جب ہماری کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی یا ہماری طلب پوری نہیں ہوتی۔

بجائے اس کے کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ شاید یہ میرے لیے بہتر ہی نہ ہو۔

اگر آپ ایک بات کو اپنے ذہن میں بٹھا لیں کہ آپ کے نصیب کے بارے میں، آپ کی زندگی کے بارے میں، اور آپ کے مستقبل کے بارے میں جتنا اللہ جانتا ہے، اتنا آپ خود بھی نہیں جانتے، تو پھر زندگی کو دیکھنے کا آپ کا انداز ہی بدل جائے گا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زندگی میں کچھ چیزیں ہمیں اپنے لیے بہت بہتر لگ رہی ہوتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو نہ جانے میرا کیا بنے گا، یا اس کے بغیر تو زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اس وقت ہمیں یہی محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ چیز نہ ملی تو ہمارے ساتھ بہت بڑا ظلم ہو جائے گا۔

لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ دعا قبول ہو جاتی، اگر وہ خواہش پوری ہو جاتی، تو شاید وہی چیز ہماری زندگی میں اذیت، پریشانی اور مصیبت کا سبب بن جاتی۔

تب ہمیں سمجھ آتی ہے کہ جس چیز کے نہ ملنے پر ہم رو رہے تھے، شاید اسی میں ہمارے لیے خیر چھپی ہوئی تھی۔

بعض اوقات آپ اپنی دعاؤں میں خود اپنے لیے ایسی چیز مانگ رہے ہوتے ہیں جو بعد میں آپ کی بربادی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لیے جو دعائیں آپ کے حق میں قبول نہیں ہوتیں، ان کے بارے میں یہ یقین رکھا کریں کہ یقیناً ان میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوگی، یا پھر اگر ہماری کوئی خواہش پوری نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ ہم سے بہتر جانتے ہیں کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے۔

سوچیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ اپنے بندے سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔

اگر اس جملے کو ویسے سنا جائے تو شاید یہ صرف محبت کے اظہار کے لیے کہے گئے عام سے الفاظ محسوس ہوں، لیکن کبھی غور کیا ہے؟

کبھی دیکھا ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ کسی کانٹے دار پھول کو اٹھانے کے لیے ضد کر رہا ہو، وہ پھول اسے بہت خوبصورت، دلکش اور اپنی طرف کھینچنے والا لگ رہا ہو، لیکن اس کی ماں اسے اٹھانے نہ دے

بچہ صرف پھول کی خوبصورتی دیکھ رہا ہوتا ہے، مگر اس کے پیچھے چھپے ہوئے کانٹوں کی حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے۔

وہ نہیں جانتا کہ اگر اس نے اسے پکڑ لیا تو وہی خوبصورت پھول اس کے ہاتھ زخمی کر دے گا۔

اسی لیے ماں اسے روک دیتی ہے۔

وہ بچے سے دشمنی نہیں کر رہی ہوتی، نہ اس کی خوشی چھین رہی ہوتی ہے بلکہ وہ صرف اس نقصان کو دیکھ رہی ہوتی ہے جسے بچہ ابھی دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

تو جب ایک ماں، جو اپنے بچے سے بے حد محبت کرتی ہے، اسے صرف ایک کانٹے دار پھول سے بچانے کے لیے اتنی سنجیدگی اختیار کر سکتی ہے تو پھر وہ اللہ جو ستر ماؤں سے بھی زیادہ اپنے بندے سے محبت کرتا ہے

کیسے آپ کو ایسی چیز حاصل کرنے دے گا جو آپ کے لیے نقصان دہ ہو؟

ہماری بہت سی خواہشات، یا یوں کہیے کہ وہ چیزیں جنہیں ہم خواہشات کا نام دیتے ہیں ہمارے سامنے بھی بالکل اسی خوبصورت پھول کی طرح آتی ہیں۔

وہ ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہیں ہمیں لگتا ہے کہ اگر یہ مل گئی تو ہماری زندگی مکمل ہو جائے گی ہماری خوشی اسی میں ہے اور ہماری کامیابی بھی اسی میں ہے۔

لیکن ہمیں اس پھول کے پیچھے چھپے ہوئے کانٹوں کا علم نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اگر ہم اسے حاصل کر بھی لیں تو وہ ہمارے لیے کتنی تکلیف، کتنی آزمائش یا کتنا نقصان لے کر آئے گی۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے ہمارا رب جانتا ہے اور ہم نہیں جانتے۔ اسی لیے بعض اوقات وہ ہماری کچھ خواہشات پوری نہیں کرتا، کیونکہ اس کی نظر صرف ہماری آج کی خوشی پر نہیں بلکہ ہماری پوری زندگی، ہمارے انجام اور ہماری بھلائی پر ہوتی ہے۔

اس لیے خواہشات کرنا یا انہیں حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا بالکل بھی بری بات نہیں ہے۔

لیکن خود کو صرف ایک ہی خواہش تک محدود کر لینا، یا اپنی پوری زندگی کو اسی ایک خواہش پر روک دینا، یقیناً درست نہیں۔

دنیا بہت وسیع ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جو زندگی ہمیں عطا کی ہے وہ ہماری بہت سی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے۔

اگر ہماری کوئی ایک خواہش پوری نہیں ہوتی تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شاید وہ واقعی ہمارے لیے بہتر نہیں تھی۔

جو لوگ خواہشات سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی حکمت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اپنی زندگی کی مایوسیوں میں ٹوٹ کر بکھر نہیں جاتے۔

اگر کبھی انہیں مایوسی آ بھی جائے تو وہ دوبارہ کھڑے ہوتے ہیں، اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں اور اپنی زندگی کا سفر ایک نئی امید کے ساتھ دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔

❖ باب ششم ❖

کتابوں کے قیدی جملے

ہماری زندگی میں بچپن سے ہمیں بہت سی ایسی باتیں سکھائی جاتی ہیں، اور وقت کے ساتھ ہم خود بھی بے شمار ایسے جملے پڑھتے اور سنتے ہیں جن کا تعلق براہِ راست ہماری عملی زندگی سے ہوتا ہے۔

مگر افسوس کہ ان میں سے اکثر جملے صرف ہماری زبان تک محدود رہ جاتے ہیں۔ ہم انہیں دہراتے ضرور ہیں، مگر کبھی اپنی زندگی کا حصہ بنانے کی حقیقی کوشش نہیں کرتے۔

ایسے جملے ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ **"اللہ کافی ہے۔"** ہم مانتے ہیں کہ **"اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔"** ہم اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ **"یہ دنیا فانی ہے۔"** یہ سب حقیقتیں ہیں، جنہیں ہم زبان سے تسلیم تو کرتے ہیں، مگر کیا کبھی ہم نے انہیں اپنے دل میں اتارا ہے؟ کیا کبھی ہم نے انہیں اپنی زندگی کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے دیا ہے؟

ذرا صرف ایک جملے پر غور کیجیے:

"اللہ کافی ہے۔"

ہر مسلمان اس جملے کا اقرار کرتا ہے۔ مگر کیا ہم نے کبھی اس کی گہرائی کو محسوس کیا ہے؟

اگر واقعی اللہ کافی ہے، تو پھر اس کے بعد کسی اور سہارے کی بے چینی کیوں؟ اگر وہ ذات ہمارے ساتھ ہو، اگر وہ ہم سے راضی ہو جائے، تو پھر دنیا کی کون سی کمی ہمیں بے چین کر سکتی ہے؟

اگر ہم اس حقیقت کو دل سے مان لیں، تو شاید وہ دکھ بھی ہمیں عزیز لگنے لگے جو ہمیں اللہ کے قریب لے آئے، اور وہ خوشی بھی ہمیں پسند نہ آئے جو ہمیں اس سے دور کر دے۔

لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔

ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ اللہ کافی ہے، مگر جیسے ہی کوئی پریشانی آتی ہے، کوئی مصیبت دروازہ کھٹکھٹاتی ہے، کوئی چھوٹی سی تکلیف بھی ہمیں چھو لیتی ہے، ہم گھبرا جاتے ہیں۔

اگر کوئی ہمارے بارے میں چند تلخ الفاظ کہہ دے، کاروبار میں نقصان ہو جائے، کسی عزیز کی جدائی نصیب ہو جائے یا کوئی خواہش پوری نہ ہو، تو ہمیں یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے زندگی ختم ہو گئی ہو، جیسے اب جینے کی کوئی وجہ باقی نہ رہی ہو۔

یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ ہم نے اس جملے کو صرف زبان سے مانا تھا، دل سے نہیں۔

ہم نے ان تمام خوبصورت حقیقتوں کو کتابوں تک محدود کر دیا ہے۔ جیسے ماضی کے واقعات صرف تاریخ کی کتابوں میں محفوظ رہ گئے، ویسے ہی یہ عظیم جملے بھی ہماری کتابوں کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔

ہم انہیں پڑھتے ہیں، دوسروں کو سناتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی ان پر تقریریں بھی کرتے ہیں، مگر اپنی زندگی میں ان کے مطابق جینا بھول جاتے ہیں۔

اگر ہم اپنی ہر مشکل کے وقت صرف ایک لمحے کے لیے یہ یاد کر لیں کہ **"اللہ کافی ہے،"** تو شاید مایوسی کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہے۔

گھبراہٹ کی بھی کوئی وجہ نہ رہے، کیونکہ جس انسان کا سہارا اللہ ہو، وہ کبھی تنہا نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہم سب اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ **یہ دنیا فانی ہے۔**

اگر واقعی ہم اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں، تو پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔

اگر دنیا فانی ہے، تو رشتوں کو کھونے کا اتنا خوف کیوں؟

اگر دنیا فانی ہے، تو ناکامی ہمیں اتنی بڑی کیوں لگتی ہے؟

اگر دنیا فانی ہے، تو "لوگ کیا کہیں گے؟" یہ سوال ہماری زندگی پر حکومت کیوں کرتا ہے؟

اگر دنیا فانی ہے، تو دنیاوی خواہشات پوری نہ ہونے پر ہم اتنے بے چین کیوں ہو جاتے ہیں؟

اگر دنیا فانی ہے، تو پھر دنیا کی دوڑ میں سب سے آگے نکلنے کی بے تابی کیوں ہے؟

کیا ہم نے کبھی خود سے یہ سوال کیے ہیں؟

شاید نہیں۔

حالانکہ یہی وہ سوال ہیں جو انسان کی سوچ کا زاویہ بدل دیتے ہیں۔ یہ سوال ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنے الفاظ اور اپنے عمل کا موازنہ کریں۔ ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ یہ جملے یونہی نہیں لکھے گئے، نہ ہی یہ صرف کتابوں کی زینت بننے کے لیے ہیں۔

زندگی بار بار ایسے حالات پیدا کرتی ہے جب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ فلاں بات واقعی درست تھی، فلاں نصیحت سچی تھی، اور فلاں حقیقت وقت آنے پر ہمارے سامنے کھل کر آ گئی۔ مگر اس کے باوجود ہم سبق نہیں سیکھتے۔

ہم اگلی بار پھر وہی غلطی دہراتے ہیں، پھر وہی خوف پال لیتے ہیں، پھر انہی حقیقتوں کو صرف پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

شاید مسئلہ یہ نہیں کہ ہمیں سچ معلوم نہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے سچ کو اپنی زندگی میں جگہ نہیں دی۔

اسی طرح ایک اور جملہ ہے جو ہم اپنی روزمرہ زندگی میں بہت عام طور پر استعمال کرتے ہیں، خاص طور پر کسی دکھی انسان کو تسلی دینے کے لیے:

"اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔"

ہم یہ جملہ دوسروں سے تو بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں، مگر کیا کبھی ہم نے اسے اپنی زندگی میں بھی سچ مانا ہے؟

شاید نہیں۔

کیونکہ جب آزمائش ہمارے اپنے دروازے پر دستک دیتی ہے تو ہماری زبان بدل جاتی ہے۔ پھر ہم کہتے ہیں:

"میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟"

"آخر میں ہی کیوں؟"

"اگر میری یہ خواہش پوری ہو جاتی تو کیا ہو جاتا؟"

"اگر میرے ساتھ یہ حادثہ نہ ہوتا تو کیا فرق پڑ جاتا؟"

ایسے بے شمار سوال ہمارے ذہن میں جنم لیتے ہیں۔ مگر ان سوالوں کے ہجوم میں ہم اس ایک جملے کو بھول جاتے ہیں جسے ہم دوسروں کو سمجھاتے رہتے ہیں۔

اگر واقعی اللہ تعالیٰ کسی انسان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، تو پھر شاید اس نے میرے اندر بھی یہ آزمائش برداشت کرنے کی صلاحیت رکھی ہوگی۔ شاید اسی لیے اس نے مجھے اس امتحان کے لیے چنا ہے۔

اسی طرح ہم اکثر یہ بھی کہتے ہیں:

"جتنی آزمائش سخت ہوگی، اتنا ہی اس کا اجر بھی بڑا ہوگا۔"

یہ جملہ بھی ہم بہت آسانی سے زبان پر لے آتے ہیں، مگر جب آزمائش واقعی سخت ہو جاتی ہے تو ہمیں اجر یاد ہی نہیں رہتا۔ اس وقت ہماری نظر صرف اپنے دکھ پر ہوتی ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ ہمارے ساتھ ظلم ہوا ہے، ہمارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے، یا ہمیں اتنی تکلیف نہیں ملنی چاہیے تھی۔

اس لمحے ہم صرف اپنی تکلیف کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، اس تکلیف کے پیچھے چھپی ہوئی حکمت کو نہیں۔

حالانکہ اگر انسان ایک حقیقت کو دل سے سمجھ لے تو شاید اس کی بہت سی شکایتیں خود بخود ختم ہو جائیں۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں اپنی مرضی سے نہیں آئے۔ جب آنے کا اختیار ہمارا نہیں تھا، تو جانے کا اختیار بھی ہمارا نہیں ہے۔

ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ اگلا لمحہ ہمارے لیے کیا لے کر آئے گا، کل ہماری زندگی میں کیا ہونے والا ہے، یا ہم اگلے سال اس دنیا میں موجود بھی ہوں گے یا نہیں۔

جب ہمیں اپنی زندگی کے اگلے لمحے تک کا علم نہیں، تو پھر ہم اپنی تقدیر کے خلاف اتنی بے چینی کیوں پال لیتے ہیں؟

ایسی خواہشات کے ساتھ خود کو کیوں باندھ لیتے ہیں جن کا پورا ہونا شاید ہماری قسمت میں ہی نہ ہو؟

ہم دوسروں کو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس آزمائش کا بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا، یا اللہ کسی پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

مگر اگر یہی جملے ہمارے اپنے دل میں بھی اتر جائیں، تو شاید ہم اپنی تکلیفوں کا الزام نہ قسمت کو دیں گے اور نہ ہی قسمت بنانے والے رب کو۔

اگر ہماری زندگی کا اصل مقصد صرف آخرت ہو، اگر ہماری سب سے بڑی خواہش اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہو، اور اگر ہم اپنی زندگی اس کے بتائے ہوئے راستے پر گزارنے کی کوشش کریں، تو پھر دنیا کی تکلیفیں ہمیں اتنا خوفزدہ نہیں کریں گی۔

آخر ہم گھبراتے کب ہیں؟

ہم تب گھبراتے ہیں جب ہم اس دنیا کو ہمیشہ رہنے والی جگہ سمجھ لیتے ہیں، جب ہم اس سے ایسی وابستگیاں بنا لیتے ہیں جیسے ہمیں کبھی مرنا ہی نہیں۔

حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

موت برحق ہے۔ وہ ضرور آئے گی، چاہے ہم اسے یاد رکھیں یا بھول جائیں۔ اور جس طرح موت یقینی ہے

اسی طرح حشر کا دن بھی یقینی ہے۔

پھر عقل مندی کس میں ہے؟

اسی میں کہ ہم ان خوبصورت اور سچے جملوں کو صرف کتابوں کی زینت نہ بنائیں، بلکہ انہیں اپنی زندگی کا حصہ بنا لیں۔

کیونکہ وہ جملے جن پر عمل نہ کیا جائے، وہ صرف الفاظ رہ جاتے ہیں؛ اور جو الفاظ دل میں اتر جائیں، وہ انسان کی پوری زندگی بدل دیتے ہیں۔

اصل فائدہ تو اسی میں ہے کہ انسان ان حقیقتوں کو وقت گزرنے کے بعد نہیں، بلکہ وقت آنے سے پہلے سمجھ لے۔

کیونکہ جب آزمائش آتی ہے تو اکثر انسان ایسے فیصلے کر بیٹھتا ہے جن پر بعد میں عمر بھر افسوس کرتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس آزمائش کو ہماری تقدیر میں لکھ دیا ہے، وہ اپنے وقت پر آ کر رہے گی۔

جس مقام پر ہمیں آزمایا جانا ہے، ہم وہیں آزمائے جائیں گے۔ اس سے بھاگا نہیں جا سکتا۔

لیکن اگر ان آزمائشوں سے پہلے ہی انسان ان حقیقتوں کو سمجھ لے، اللہ پر توکل کرنا سیکھ لے، اور زندگی کی اصل حقیقت کو جان لے، تو شاید وہی آزمائش اس کے لیے تباہی

نہیں بلکہ کامیابی کا ذریعہ بن جائے۔

زندگی کسی پر رحم نہیں کرتی۔

اس کے امتحانات نہایت سخت ہوتے ہیں۔ آج تک نہ کوئی ان سے بچ سکا ہے اور نہ ہی آئندہ کوئی بچ سکے گا۔

نہ کسی کی بادشاہت ہمیشہ قائم رہی، نہ کسی کی غربت ہمیشہ رہی۔

نہ کوئی ہمیشہ خوش رہا، نہ کوئی ہمیشہ غم میں ڈوبا رہا۔ نہ کوئی ہمیشہ صحت مند رہا، نہ کوئی ہمیشہ بیمار۔

کیونکہ یہ سب وقت کے تابع ہیں، اور وقت کا سب سے بڑا اصول یہی ہے کہ وہ کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔

حالات بدلتے ہیں، انسان بدلتا ہے، اس کی سوچ بدلتی ہے، اس کے تجربات بدلتے ہیں، اور زندگی کو دیکھنے کا زاویہ بھی بدل جاتا ہے۔

پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان مڑ کر اپنی زندگی کو دیکھتا ہے اور بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

"واقعی یہ باتیں سچ تھیں۔"

تب اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ جملے صرف خوبصورت الفاظ نہیں تھے، بلکہ ان لوگوں کے تجربات تھے جنہوں

نے زندگی کو جیا، اس کے امتحانات سے گزرے، اور پھر اپنی زندگی کا نچوڑ چند لفظوں میں لکھ گئے۔

تب انسان کو سمجھ آنے لگتی ہے کہ یہ جملے صرف کتابوں تک محدود نہیں، بلکہ زندگی کے اصول ہیں۔

کیونکہ انسان کی فطرت ایک جیسی ہے۔

دکھ تقریباً سب کے حصے میں آتے ہیں۔

ہر کسی کو کسی نہ کسی دن اپنے پیاروں کی جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی وقت ناکامی دیکھتا ہے۔

کاروبار میں نقصان بھی ہر کسی کو ہو سکتا ہے، بیماری بھی ہر دروازے پر دستک دے سکتی ہے، اور آزمائش بھی کسی کو چھوڑ کر نہیں گزرتی۔

فرق صرف ایک چیز کا ہوتا ہے۔

ہر انسان کی کہانی مختلف ہوتی ہے، اور ان حالات کو سنبھالنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔

یہی اصل فرق ہے۔

اگر انسان ان چند حقیقتوں پر گہرائی سے غور کر لے، تو
شاید اس کی زندگی پہلے سے کہیں زیادہ پُرسکون ہو
جائے۔

جیسے میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں، جب انسان واقعی اللہ
تعالیٰ پر توکل کرنا سیکھ لیتا ہے، تب اس کے اندر ایک
عجیب سا سکون پیدا ہو جاتا ہے۔

شاید آپ میں سے بہت سے لوگوں نے بھی زندگی میں
کبھی نہ کبھی وہ لمحہ ضرور محسوس کیا ہوگا، جب انسان
بے اختیار یہ دعا کرتا ہے:

"اے اللہ**!** مجھے وہ دکھ عطا کرنا جو مجھے تیرے قریب
کر دے، لیکن وہ خوشی کبھی نہ دینا جو مجھے تجھ سے
دور کر دے۔"

آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس لیے کہ اس مقام پر انسان کا توکل اپنے رب پر مضبوط
ہو چکا ہوتا ہے۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر صرف
زبان سے نہیں، بلکہ دل کی گہرائی سے یقین رکھتا ہے۔

اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتے۔ اگر کسی تکلیف کا اجر دنیا میں نہیں ملا، تو آخرت میں ضرور ملے گا، اور ایسا ملے گا کہ دنیا کے تمام غم معمولی محسوس ہونے لگیں گے۔

اسی یقین کے بعد انسان کی منزل بھی بدل جاتی ہے۔

پھر اس کی سب سے بڑی خواہش دنیا کی آسائشیں نہیں رہتیں، بلکہ آخرت کی کامیابی بن جاتی ہے۔

پھر وہ جان لیتا ہے کہ اس کی اصل منزل یہ دنیا نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ رہنے والی زندگی ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی رحمت ہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اسی لیے جب تک حقیقتیں صرف پڑھی جاتی رہیں، وہ کتابوں کے قیدی جملے ہی رہیں گی۔

لیکن جس دن ہم نے انہیں اپنے دل میں اتار لیا، اپنی سوچ کا حصہ بنا لیا، اور اپنی عملی زندگی میں نافذ کر لیا، اسی دن انسان حقیقی معنوں میں آزاد ہو جاتا ہے۔

یہ آزادی دنیا کی کسی قید سے آزاد ہونے کی نہیں، بلکہ خوف، بے چینی، مایوسی اور دنیا کی عارضی وابستگیوں سے آزاد ہونے کی آزادی ہے۔

پھر دنیا کی کوئی آزمائش اسے مکمل طور پر توڑ نہیں سکتی، کوئی نقصان اسے اللہ سے بدگمان نہیں کرتا، اور کوئی مصیبت اس کے صبر کو ختم نہیں کر سکتی۔

پھر ہر حال میں اللہ پر توکل کرنا اسے بوجھ نہیں، بلکہ سکون محسوس ہوتا ہے۔

ہر مشکل میں اسے اپنے رب کی حکمت نظر آنے لگتی ہے، اور ہر آزمائش میں اسے اپنے رب کی رحمت کی امید رہتی ہے۔

شاید انسان کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ وہ کتابوں میں لکھی ہوئی حقیقتوں کو اپنی زندگی کی حقیقت بنا لے۔

کیونکہ جو جملے صرف زبان پر رہ جائیں، وہ انسان کو کبھی نہیں بدلتے؛ لیکن جو دل میں اتر جائیں، وہ پوری زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں۔

سکون آخر کہاں ملتا ہے؟

ان تمام سوالات، تجربات اور حقیقتوں کو جاننے کے بعد جن کا ذکر میں اس کتاب میں کر چکی ہوں، میں ایک ہی نتیجے پر پہنچی ہوں کہ سب سے پہلے اگر کسی تعلق کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے تو وہ ہمارا اپنے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی بھی ہماری روح کی خالی جگہ کو نہیں بھر سکتا۔ ہم کسی انسان سے کتنی ہی امیدیں کیوں نہ وابستہ کر لیں، وہ ایک نہ ایک دن ہمیں مایوس ضرور کر دیتا ہے۔ لیکن صرف ایک اللہ کی ذات ہے جو نہ ہمارے دکھ بھولتی ہے، نہ ہمارے صبر کے لمحے، نہ ہماری خاموش دعائیں، اور نہ ہی ہمارے آنسو۔

وہ ہماری ناشکری بھی دیکھتا ہے اور ہماری ندامت بھی۔

اسی لیے اگر کبھی زندگی میں اپنے گناہوں پر شرمندگی محسوس ہو، اگر کبھی اپنے رب کے سامنے ہاتھ اٹھانے میں جھجک محسوس ہو، تو ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے کہ

شاید ہماری بہت سی دعائیں ہماری مصلحت کی وجہ سے قبول نہ ہوں، مگر سچی توبہ، ندامت اور اپنے رب کی طرف پلٹنے والا دل کبھی رد نہیں کیا جاتا۔

کتنی عظیم ہے وہ ذات جو ہمارے صرف چند قدم اپنی طرف بڑھانے پر ہمیں معاف کر دیتی ہے، ہمارے گناہوں پر پردہ ڈال دیتی ہے، اور ہماری ٹوٹی ہوئی امیدوں کو پھر سے جوڑ دیتی ہے۔ وہ ہمارے الفاظ سے زیادہ ہمارے دل کی کیفیت کو دیکھتی ہے۔

اگر ایسی مہربان ذات ہمارے ساتھ ہو، تو پھر دنیا کے دروازوں پر مایوس ہو کر دستک دینے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟

ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے...

دنیا کبھی آپ کو مکمل خوش نہیں کر سکتی۔ دنیا کبھی آپ کے دل کی ہر خواہش پوری نہیں کرے گی۔ دنیا کبھی یہ نہیں دیکھے گی کہ آپ کا دل کہاں ٹوٹا، آپ کتنی راتیں

جاگ کر روئے، یا آپ نے کتنی خاموش تکلیفیں برداشت کیں۔

یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے، سکون کی نہیں۔

اگر کوئی ذات آپ کو حقیقی سکون دے سکتی ہے، آپ کے دل کو اطمینان بخش سکتی ہے، آپ کی ٹوٹ پھوٹ کو جوڑ سکتی ہے اور آپ کو ہر حال میں مضبوط بنا سکتی ہے، تو وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

اسی لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے رب کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں، تاکہ دنیا کی بڑی سے بڑی آزمائش بھی ہمارے صبر کو نہ توڑ سکے، ہمارے یقین کو کمزور نہ کر سکے، اور ہم صرف اپنے رب پر توکل کی طاقت سے ہر مشکل راستہ طے کر سکیں۔

آخر میں صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گی کہ زندگی ہمیشہ آپ کی مرضی کے مطابق نہیں چلے گی، مگر اگر آپ کا ہاتھ اللہ کے ہاتھ میں ہو تو زندگی کا ہر راستہ آسان محسوس ہونے لگتا ہے۔

جب انسان اللہ پر یقین کرنا سیکھ لیتا ہے، تو پھر حالات بدلیں یا نہ بدلیں، اس کا دل بدل جاتا ہے۔ اور جس دن دل بدل جائے، اسی دن زندگی بھی بدلنا شروع ہو جاتی ہے۔

کیونکہ سکون حالات میں نہیں، اللہ کے ساتھ تعلق میں ہوتا ہے۔ اور جس نے اپنے رب کو پا لیا، اس نے زندگی کی سب سے قیمتی دولت حاصل کر لی۔